ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام! نومبر حکیم الامت کے یوم پیدائش کا مہینہ ہے۔ انہی کی ایک نظم سے آغاز کرتے ہیں۔ ضربِ کلیم میں شامل یہ نظم ترکی ہلال احمر کے وفد کے دورہ لاہور کے موقع پر کہی گئی۔

کہا مجاہدِ ترکی نے مجھ سے بعدِ نماز — طویل سجدہ ہیں کیوں اس قدر تمہارے امام
وہ سادہ مردِ مجاہد، وہ مومنِ آزاد — خبر نہ تھی اسے کیا چیز ہے نمازِ غلام
ہزار کام ہیں مردانِ حُر کو دنیا میں — انہی کے ذوقِ عمل سے ہیں امتوں کے نظام
طویل سجدہ اگر ہیں تو کیا تعجب ہے — ورائے سجدہ غریبوں کو اور کیا ہے کام
خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو — وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

ایک صدی قبل لکھی جانے کے بعد بھی اور آزادی کی پون صدی گزار لینے کے باوجود یہ نظم ہمارے لیے بہت سے پیغام رکھتی ہے۔

کئی ماہ کے بعد یہ مہینہ قدرے پرسکون گزرا۔ اگرچہ کراچی میں ہلاکتوں اور بھتہ خوریوں کا سلسلہ جاری رہا مگر ہم کسی بڑے سانحے، بم دھماکے کے نتیجے میں جانی نقصان یا دہشت گردانہ کارروائیوں سے بچے رہے۔ وزیراعظم کے دورہ امریکہ کے ثمرات پر خاصی بحث ہوتی رہی۔ شاید دہشت گردی میں یہ وقفہ بھی انہی ثمرات میں سے ایک تھا! بہرحال وزیراعظم نے اوباما سرکار کے حضور ڈرون حملوں کے بارے میں عاجزانہ، عرضداشت پیش کردی۔ حالانکہ اس وقت دنیا بھر میں امریکہ کے ''غیر انسانی'' ڈرون حملوں کے خلاف بہت سازگار فضا بن چکی ہے۔ وڈیو گیم کی طرز پر انسانوں کے قتلِ عام کے خلاف آگاہی بڑھ گئی ہے اور خود امریکہ کو اپنے شہریوں کی جانب سے مخالفت کا سامنا ہے۔ پاکستان اس صورتحال پر نہایت مضبوطی اور اعتماد سے اپنا مؤقف پیش کرسکتا تھا۔ یو این جنرل اسمبلی میں ڈرون حملوں کے ذریعے بے گناہ شہریوں کی ہلاکتوں کے خلاف رپورٹ پیش ہوئی۔ انسانی حقوق کی دو مؤثر بین الاقوامی تنظیموں ایمنسٹی انٹرنیشنل اور ہیومن رائٹس واچ نے ڈرون حملوں کو انسانی حقوق اور بین الاقوامی قوانین کی شدید خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے ان کو جنگی جرائم میں شامل کیا۔

ڈرون حملوں کی صورت میں یہ موت کا غیر انسانی کھیل 2004ء میں بش انتظامیہ کے دباؤ پر پاکستان میں شروع ہوا۔ ابتدا میں جنرل مشرف سے یہ اجازت القاعدہ کے دس بڑوں کو ختم کرنے کے لیے لی گئی تھی مگر پھر یہ فہرست طویل ہوتی گئی اور آخر کار اُدھر اوبامہ اور اِدھر زرداری کے آنے کے بعد بالکل یکطرفہ اور نامختتم ہوگئی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ 2009ء میں پاکستانی ایجنسیوں کی جانب سے مبینہ عدم تعاون کے بعد امریکہ نے معلومات کی فراہمی کے لئے اپنے ذرائع کا بندوبست کیا جنگجو امریکیوں کو دھڑا دھڑ ویزے دلوا کر امریکی سفارت خانوں اور قونصل خانوں کو کمک پہنچائی گئی۔ ریمنڈ ڈیوس ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ سلالہ چیک پوسٹ پر حملے کے بعد پاکستان نے سرکاری طور پر ڈرون کے لیے تعاون ختم کردیا اور جیکب آباد ائیربیس بند کردی گئی تاہم امریکہ نے اپنے بل پر بذریعہ افغانستان ڈرون حملے جاری رکھے۔ یو این کو حکومتِ پاکستان کے فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق اب تک ڈرون حملوں میں 2200 ہلاکتیں ہوئی ہیں۔ جن میں سے کم از کم 400 بے گناہ

افراد تھے۔ جبکہ پشاور ہائیکورٹ کے مطابق صرف 47 مطلوبہ افراد کے علاوہ تمام ہلاک شدگان بے گناہ اور معصوم شہری تھے جنہیں فخریہ دہشت گرد کہا جاتا رہا۔ بریو نیو فاؤنڈیشن کے تحت بننے والی دستاویزی فلم نے بہت سے حقائق دنیا کے سامنے پیش کیے ہیں۔ شرمین عبید کو آسکر دینے والوں میں اخلاقی جرأت ہو تو وہ اس فلم کو بھی اکرام سے نوازیں!

ڈورنز کے ذریعے بے گناہ ہلاکتوں نے پورے وزیرستان میں انتقام کی آگ بھڑکا دی ہے۔ یہ حملے جتنے زیادہ ہوں گے پاکستان اتنا ہی غیر محفوظ ہوگا۔ جس ملک کی پارلیمنٹ ان حملوں کے خلاف قرارداد منظور کر چکی ہو، عدالتِ عالیہ ان کو غیر قانونی اور ملکی خودمختاری کے منافی قرار دے چکی ہو۔ کل جماعتی کانفرنس میں عوامی نمائندوں کی بھاری اکثریت مذاکرات کو معاملے کا حل سمجھتی ہو، وہاں ڈرون حملے جاری رہنے کا کون سا جواز باقی رہ جاتا ہے، سوائے اس کے کہ ہماری قومی خودمختاری کا سودا ہو چکا اور طرزِ غلامی ہمیں راس آ چکی!

معزز قارئین! محرم کا مہینہ ہمیں ہر سال نواسۂ رسول حضرت امام حسینؓ کی عظیم جدوجہد اور قربانی کی یاد دلاتا ہے، یہ جدوجہد ایک جابر حکمران کے خلاف تھی جو اپنی قوت کے زور پر مسلم قوم کی آزاد مرضی کے خلاف ایک عظیم اسلامی سلطنت کا حکمران بن بیٹھا تھا۔ یہ اللہ کی مشیت ہے کہ امت مسلمہ کو ایسے ظالموں سے سابقہ پیش آتا رہا ہے اور اب بھی مصر میں وہی تاریخ دہرائی گئی۔ صدر مرسی کی عوام کی آزاد مرضی سے قائم ہونیوالی حکومت برطرف کر دی گئی اور قوت کے زور پر ایک ملٹری ڈکٹیٹر نے ملک پر قبضہ جما لیا۔ حضرت حسینؓ کے ہزاروں پیروکاروں کو ٹینکوں تلے کچل دیا گیا۔ جزا اور سزا کے آخری فیصلے تو اللہ کی عدالت میں ہی ہوں گے۔

ملالہ کو نوبل انعام تو نہ مل سکا مگر اس کے (متنازعہ طور پر!) خیالات پر مبنی کرسٹینا لیمب کی تحریر کردہ کتاب ضرور امریکہ میں ہر سٹال پر سج گئی۔ ضیاء الحق کے جس دور میں اسے افسوس ہے کہ لڑکیوں کو نیکر کی بجائے پاجامے پہن کر کھیلنا پڑتا تھا، اس وقت تو وہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ قادیانیت، توہینِ رسالتؐ اور طالبانائزیشن جیسے حساس اور نازک نوعیت کے امور پر عالمی استعمار کے نقطۂ نظر کو ہو بہو ہرانے والی ملالہ جس طرح ملک و قوم کے خلاف استعمال ہو رہی ہے اسے دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ امریکہ بہادر ہمارے مستقبل کی فکر ہم سے کہیں زیادہ کرتا ہے۔ اس بچی کو بھی شاید اس لیے پال پوس کر تیار کیا جا رہا ہے تاکہ مستقبل کے پاکستان کی صورت گری اپنے من چاہے خطوط پر کی جاتی رہے۔

خورشید رضوی کے ان خوبصورت اشعار کے ساتھ اجازت۔

یہ سب زمین و زماں پھر بنانا چاہتا ہوں — بگڑ گیا ہے جہاں، پھر بنانا چاہتا ہوں
جو میرے اپنے ہوں اور میرے اپنے ہاتھ میں ہوں — وہی پھر بنانا چاہتا ہوں
بہت دنوں سے اسے سن کے جاگتے نہیں دِل — حرم کی طرزِ اذاں پھر بنانا چاہتا ہوں
زمینِ مردہ کو دیتا ہوں خونِ دل خورشید — میں اس میں ذرہِ جاں پھر بنانا چاہتا ہوں

طالب دعا

صائمہ اسما

ڈاکٹر مقبول احمد شاہد

قرآن کا معجزہ

وہ کتاب جس کے مقابلے میں دنیا کی کوئی کتاب نہیں لائی جاسکتی، جو زبان وادب کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے اور تعلیم وحکمت کے لحاظ سے بھی

۱۴۔قرآن کا جنوں کے لیے کتاب ہدایت ہونا:

قرآن کا ایک معجزہ یہ ہے کہ یہ کتاب جس طرح انسانوں کے لیے کتاب ہدایت ہے اسی طرح جنوں کے لیے بھی ہدایت کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طرح جنوں کے لیے بھی ان کی ہدایت کے لیے انہی کے گروہ میں انہی کی جنس سے انبیاء بھیجے اور کتابیں نازل کیں جیسا کہ ہمیں درج ذیل آیات سے پتہ چلتا ہے۔

''(قیامت کے روز اللہ یہ بھی پوچھے گا) کہ اے گروہ جن وانس کیا تمھارے پاس خود تم ہی میں سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے اور اس دن کے انجام سے ڈراتے تھے۔ وہ کہیں گے، ہاں ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں۔ آج دنیا کی زندگی نے ان لوگوں کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے مگر اس وقت وہ اپنے خلاف خود گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے (یہ شہادت ان سے اس لیے لی جائے گی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ) تمھارا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جبکہ ان کے باشندے حقیقت سے ناواقف ہوں۔''
(الانعام ۱۳۰، ۱۳۱)

دلچسپ بات یہ ہے کہ اگرچہ انسان جنات کو نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ ان کے حالات سے باخبر ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے انبیاء اور آسمانی کتابوں یا صحیفوں کے بارے میں انہیں کوئی معلومات ہیں لیکن اس کے برعکس جنات نہ صرف انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں بلکہ ان کے حالات سے بھی باخبر رہتے ہیں جیسا کہ اس آیت میں فرمایا گیا:

''شیطان اور اس کا قبیلہ تم کو ایسی جگہ سے دیکھ رہا ہے جہاں تم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔'' (الاعراف ۲۷)

اسی طرح کیونکہ وہ آگ سے پیدا کیے گئے ہیں اس لیے وہ سریع الحرکت ہیں۔ مزید یہ کہ وہ با آسانی مختلف شکلیں اختیار کر لیتے ہیں اور ان مقامات پر غیر محسوس طریقے سے نفوذ کر جاتے ہیں جہاں انسان نفوذ نہیں کر سکتا۔

جنات کی ان صلاحیتوں کی وجہ سے ان کو یہ برتری (Privilege) حاصل ہے کہ اپنے انبیاء کے علاوہ وہ ان انبیاء کی تعلیمات سے بھی استفادہ کر سکتے ہیں جو انسانوں میں مبعوث ہوئے اور ان کتابوں سے ہدایت حاصل کر سکتے ہیں جو انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل

کی گئیں۔ قرآن کریم میں درج ذیل دو مقامات پر ہمیں بتایا گیا کہ جنات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست قرآن سنا اور اس پر ایمان لائے۔

''(اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمھاری طرف لے آئے تھے تا کہ قرآن سنیں۔ جب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انھوں نے آپس میں کہا، خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انھوں نے جا کر کہا، اے ہماری قوم کے لوگو، ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی، رہنمائی کرتی ہے حق اور راہ راست کی طرف۔ اے ہماری قوم کے لوگو، اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ۔ اللہ تمھارے گناہوں سے درگذر فرمائے گا اور تمھیں عذاب الیم سے بچا دے گا۔''

(الاحقاف ۲۹ تا ۳۱)

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ نبوی میں سفر طائف سے واپسی پر مکہ کی طرف سفر کرتے ہوئے وادیٔ نخلہ میں قیام کیا۔ وہاں عشاء یا فجر یا تہجد کی نماز میں آپ قرآن کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنوں کے ایک گروہ کا ادھر سے گزر ہوا اور وہ آپ کی قرأت سننے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس موقعہ پر جن حضور کے سامنے نہیں آئے تھے، نہ آپ نے ان کی آمد کو محسوس کیا تھا بلکہ بعد میں اللہ نے وحی کے ذریعے ان کے آنے اور قرآن سننے کی خبر دی۔

دوسرا واقعہ جو غالباً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ابتدائی دور کا واقعہ ہے سورہ جن میں اس طرح بیان ہوا ہے:

''اے نبی کہو، میری طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے غور سے سنا پھر (جا کر اپنی قوم کے لوگوں سے) کہا۔ ہم نے بڑا ہی عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس لیے ہم اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔'' (الجن ۱، ۲)

بخاری اور مسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت کے مطابق یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب آپ اپنے چند اصحاب کے ساتھ عکاظ کے بازار میں تشریف لے جا رہے تھے۔ راستے میں نخلہ کے مقام پر آپ نے صبح کی نماز پڑھائی۔ اس وقت جنوں کا ایک گروہ ادھر سے گزر رہا تھا، تلاوت کی آواز سن کر ٹھہر گیا اور غور سے قرآن سنتا رہا اور ایمان لے آیا۔

قرآن کے الفاظ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے واقعہ میں جو جن قرآن سن کر ایمان لائے تھے وہ پہلے سے حضرت موسیٰ اور کتب آسمانی پر ایمان رکھتے تھے جبکہ دوسرے واقعہ میں قرآن سننے والے جن

آخرت اور رسالت کے منکر تھے اور مشرکین میں سے تھے۔انھوں نے جب قرآن سنا تو شرک سے توبہ کی اور ایمان لے آئے۔

ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن میں بیان کیے ہوئے یہ دونوں واقعات وادیٔ نخلہ میں پیش آئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ وادی جنوں کی مستقل گزرگاہ تھی ۔ جس طرح انسان اپنے سفر کے لیے راستے اور شاہراہیں تعمیر کرتا ہے اور جس طرح بین الاقوامی پروازوں کے لیے ہوائی جہازوں کے اور سمندروں میں جہاز رانی کے راستے متعین ہوتے ہیں اسی طرح غالباً جنات نے بھی اپنے سفر کے لیے راستے مقرر کر رکھے ہیں اور ان میں سے ایک راستہ وادیٔ نخلہ سے گزرتا تھا۔

قرآن میں درج ان دو واقعات کے علاوہ احادیث کی معتبر روایات سے پتہ چلتا ہے کہ متعدد بار جنوں کے وفود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور آپؐ سے ان کی رودررو ملاقاتیں ہوتی رہیں۔اس بارے میں جو روایات کتب حدیث میں منقول ہوئی ہیں ان کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ معظّمہ میں کم از کم چھ وفد آئے تھے۔

ان میں سے ایک وفد کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں رات بھر غائب رہے۔ ہم لوگ سخت پریشان رہے کہ کہیں آپ پر حملہ نہ کر دیا گیا ہو۔صبح سویرے ہم نے آپ کو جراء کی طرف سے آتے ہوئے دیکھا۔ پوچھنے پر آپ نے بتایا کہ ایک جن مجھے بلانے آیا تھا میں نے اس کے ساتھ آ کر یہاں جنوں کے ایک گروہ کو قرآن سنایا۔(مسلم)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہی کی ایک اور روایت ہے کہ ایک مرتبہ مکہ میں حضوؐر نے صحابہ سے فرمایا کہ آج رات تم میں سے کون میرے ساتھ جنوں کی ملاقات کو چلتا ہے؟ میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مکہ کے بالائی حصہ میں ایک جگہ حضوؐر نے زمین پر لکیر کھینچ کر مجھے فرمایا کہ اس سے آگے نہ بڑھنا۔ پھر آپ آگے تشریف لے گئے اور کھڑے ہو کر قرآن پڑھنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے اشخاص ہیں جنھوں نے آپ کو گھیر رکھا ہے اور میرے اور آپ کے درمیان حائل ہیں۔(ابن جریر۔بیہقی)

ایک اور موقعہ پر رات کے وقت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور مکہ معظّمہ میں حجون کے مقام پر جنوں کے ایک مقدمہ کا آپؐ نے فیصلہ فرمایا۔اس کے سالہا سال بعد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کوفہ میں جاٹوں کے ایک گروہ کو دیکھ کر کہا کہ حجون کے مقام پر جنوں کے جس گروہ کو میں نے دیکھا تھا وہ ان جاٹوں سے بہت مشابہ تھا۔(ابن

جریر)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ رحمٰن خود تلاوت فرمائی یا آپ کے سامنے یہ سورہ پڑھی گئی۔ پھر آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ میں تم لوگوں سے ویسا اچھا جواب نہیں سن رہا ہوں جیسا جنوں نے اپنے رب کو دیا تھا۔ لوگوں نے عرض کیا وہ کیا جواب تھا؟ آپ نے فرمایا جب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد **فبای الاء ربکما تکذبان** (پس اے جن وانس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے)، پڑھتا تو جن اس کے جواب میں کہتے جاتے تھے **لا بشیء من نعمة ربنا نکذب** (ہم اپنے رب کی کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے)۔ (ابن جریر)

حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے یہ سورۂ رحمٰن اس رات جنوں کو سنائی تھی جس میں وہ قرآن سننے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ وہ اس کا جواب تم سے بہتر دے رہے تھے۔ جب میں اللہ کے اس ارشاد پر پہنچا کہ اے جن وانس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے تو وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے، حمد تیرے ہی لیے ہے۔ (ترمذی)

۱۵۔ قرآن سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتاب

دنیا میں اس وقت چھ ارب پچاس کروڑ انسان آباد ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی تعداد اگرچہ صرف ایک ارب پچاس کروڑ ہے لیکن اس کے باوجود قرآن کریم دنیا بھر میں سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتاب ہے۔ گو کہ صحیح اعداد وشمار تو نہیں دیے جا سکتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں موجود قرآن کے نسخوں کی تعداد کسی بھی دوسری کتاب کے مقابلے میں سب سے زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ کسی اور کتاب کے ترجمے اتنی زیادہ زبانوں میں نہیں ہوئے جتنی زبانوں میں قرآن کے ترجمے کیے گئے ہیں۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کے بہت کم ایسے گھر ہوں گے جہاں قرآن موجود نہ ہو اس کے مقابلے میں دوسرے مذاہب کی مذہبی کتابیں بہت کم گھروں میں موجود ہوں گی۔ یہ بھی قرآن کا عظیم معجزہ ہے۔

۱۶۔ قرآن کی کوئی بات غلط ثابت نہیں کی جا سکتی

قرآن کریم کے علاوہ دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس کے مضامین حتمی سچ (Absolute Truth) پر مبنی ہوں جبکہ قرآن کی ہر بات حتمی سچ ہے کیونکہ یہ اللہ رب العالمین کا کلام ہے جو علیم وخبیر ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اور ماضی، حال و مستقبل کی کوئی خبر، اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔ کائنات کے ہر ذرے کا حال اس کو معلوم ہے۔ اسی لیے قرآن کریم کی کوئی بات اب تک

نہ غلط ثابت کی جاسکی ہے اور نہ آئندہ غلط ثابت ہوسکتی ہے۔

قرآن کے مضامین بنیادی طور پر عقائد اور احکامات کی تعلیم پر مشتمل ہیں۔ لیکن عقائد کی تعلیم میں خصوصاً توحید کی صداقت واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی اپنی پیدائش اور کائنات کی تخلیق کے بارے میں کچھ ایسے حقائق بیان کیے ہیں جو انسان کو پہلے معلوم نہیں تھے۔ نزول قرآن کے وقت انسان نے ان حقائق کو اس علم کی روشنی میں سمجھا جو اسے اس وقت حاصل تھا۔ اس کے بعد جیسے جیسے سائنسی علوم ترقی کرتے گئے اور انسان کو خود اپنے اور کائنات کے بارے میں زیادہ علم اور شعور حاصل ہوا تو قرآن کی آیات کو پہلے سے کہیں بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہوگیا۔ اسی طرح بہت سے احکام کی مصلحتیں جو اس وقت اسے اتنی اچھی طرح سمجھ میں نہ آسکتی تھیں، سائنسی اور طبی علوم کی ترقی کے ساتھ اس پر زیادہ واضح ہوتی چلی گئیں۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ وقتی طور پر سائنس نے ایک نظریہ پیش کیا جو بظاہر قرآن کے نقطۂ نظر سے متفق نہیں تھا لیکن اس کے بعد مزید سائنسی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا کہ پہلا سائنسی نظریہ غلط تھا اور قرآن کے بتائے ہوئے حقائق ہی درست تھے۔ ذیل میں ایک مثال دی جارہی ہے:

انسان کی تخلیق:

''جو چیز اس نے بنائی خوب ہی بنائی۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی۔ پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔ پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور دل دیے۔ تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔'' (السجدہ ۷تا۹)

''اسی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا اور اس نے مویشیوں میں سے تمھارے لیے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔ وہ تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں میں تمھیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے یہی اللہ جس کے یہ کام ہیں تمھارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے پھر تم کدھر پھرے جارہے ہو۔'' (الزمر ۵، ۶)

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔ پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر اس بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کر دیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔'' (المومنون ۱۳)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان کو براہ راست اپنے تخلیقی عمل سے پیدا کیا اس کے بعد خود اسی انسان کے اندر تناسل کی یہ طاقت رکھ دی کہ اس کے نطفے سے اس طرح کے انسان پیدا ہوتے چلے جائیں۔ اس کے مقابلے میں انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک مغربی سائنس دان ڈارون کی طرف سے نظریۂ ارتقاء کے نام سے اس بات کا امکان ظاہر کیا گیا کہ انسان آدم کی شکل میں براہ راست وجود میں نہیں آیا بلکہ کم تر اور سادہ مخلوق سے ترقی کرتے ہوئے اس نے ایک برتر اور پیچیدہ مخلوق یعنی انسان کی شکل اختیار کر لی۔ جب یہ نظریہ پیش کیا گیا تو غیر مسلموں اور بے دین (سیکولر) نام نہاد مسلمانوں نے ایک واویلا مچادیا اور قرآن کی بیان کردہ حقیقت کو غلط کہنا شروع کر دیا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس موضوع پر مزید سائنسی تحقیق نے اس نظریے کی غلطی واضح کر دی اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ ڈارون نے جن مفروضوں پر اس نظریے کی بنیاد رکھی تھی وہ مفروضے ہی غلط تھے اور اگر ڈارون آج زندہ ہوتا تو وہ خود ہی اپنے نظریے سے رجوع کر لیتا۔

۱۷۔ قرآن میں سائنسی حقائق کا بیان

قرآن میں کئی مقامات پر ایسے سائنسی حقائق بیان کیے گئے ہیں جنھیں آج سے چودہ سو سال پہلے کا انسان پوری طرح سمجھنے سے قاصر تھا اور قرآن پر ایمان لانے والوں نے انھیں شرح صدر کے ساتھ اس لیے تسلیم کر لیا تھا کہ یہ اللہ کا فرمان ہے اور اس کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد جیسے جیسے انسان کی معلومات میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور سائنسی تحقیق نے بہت سے ایسے حقائق پر سے پردہ اٹھایا جو اس سے پہلے مخفی تھے تو ہمیں قرآن کی ان آیات کا مطلب زیادہ وضاحت سے سمجھ میں آنے لگا۔ یہ قرآن کا ایک معجزہ ہے کہ اس نے چودہ سو سال پہلے ہمیں اس کائنات کے بارے میں ایسے حقائق سے آگاہ کیا جو اس وقت کسی انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھے اور پھر خود انسان نے ہی اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے ان حقائق کی صداقت ثابت کر دی۔ ذیل میں اس موضوع پر کچھ مثالیں دی جارہی ہیں:

حمل کی کم سے کم مدت:

قرآن مجید میں بچے کی ماں کے پیٹ میں پرورش اور دودھ پلانے کی مدت (رضاعت) کے بارے میں درج ذیل تین آیات میں ذکر کیا گیا ہے:

''مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں اس باپ کے لیے جو رضاعت کی پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے۔'' (البقرہ ۲۳۳)

''اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں

لگے۔'' (لقمان ۱۴)

''ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اُسے اپنے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا۔ اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے۔'' (الاحقاف ۱۵)

ان تینوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر رضاعت کی مدت دو سال ہو جیسا کہ حکم دیا گیا ہے تو پھر حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ بنتی ہے اس کی اہمیت اس لیے ہے کہ اگر شادی کے بعد کسی عورت کے ہاں چھ ماہ میں بچے کی ولادت ہو جائے تو وہ اس کے شوہر کا جائز بچہ تصور ہوگا۔ اس قسم کا ایک واقعہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے میں پیش ایا۔ جب ایک شخص نے قبیلہ جہینہ کی ایک عورت سے نکاح کیا اور شادی کے چھ ہی مہینے بعد اس کے ہاں صحیح وسالم بچہ پیدا ہو گیا۔ اس شخص نے حضرت عثمانؓ کے سامنے لا کر یہ معاملہ پیش کر دیا۔ آپ نے اس عورت کو زانیہ قرار دے کر اس پر حد جاری کرنے کا حکم دے دیا۔ حضرت علیؓ نے یہ قصہ سنا تو فوراً حضرت عثمان کے پاس پہنچے اور ان کے سامنے اوپر دی ہوئی تینوں آیتیں پڑھیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حمل کی کم سے کم مدت چھ ماہ ہو سکتی ہے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور وہ بچہ اس شخص کا جائز بچہ قرار پایا۔

یہ سب اس زمانے کی بات ہے جب علم ولادت (Obstetrics) کی سائنس کا کوئی تصور نہیں تھا اور اس موضوع پر معلومات اسی حد تک تھیں جو عام مردوں اور عورتوں کو ہو سکتی تھیں اور حمل کی مدت عموماً نو ماہ ہی سمجھی جاتی تھی۔ اب اس وقت جدید سائنس نے ہمیں جو معلومات دی ہیں ان کے مطابق کل مدتی حمل (Full Term Pregnancy) کا دورانیہ ۲۸۰ دن مقرر کیا گیا ہے۔ یہ نو ماہ اور دس دن یا چالیس ہفتے بنتے ہیں، جدید طبی تحقیقات کی رو سے ماں کے پیٹ میں ایک بچے کو کم از کم ۲۸ ہفتے درکار ہوتے ہیں جن میں وہ نشوونما پا کر زندہ ولادت کے قابل ہو سکتا ہے۔ یہ مدت ۱۹۶ دن یا چھ ماہ اور ۱۶ دن بنتی ہے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ان مدتوں کا تعین آخری ایام حیض کی ابتدا سے کیا جاتا ہے اور اس مدت میں آخری ایام حیض بھی شامل ہیں۔

پھر یہ معلوم کرنا بھی ممکن نہیں کہ ایام حیض ختم ہونے کے بعد استقرارِ حمل کب ہوا۔ یہ عمل پندرہ دنوں میں کسی بھی وقت ہو سکتا ہے اس طرح دو ہفتے کی کمی بیشی کا امکان تو ہو ہی سکتا ہے۔ اور اصل کم سے کم مدت ساڑھے چھ ماہ سے چھ ماہ تک ہو سکتی ہے۔

اب تک مدتوں کے اوقات کا یہ حساب ان عورتوں

کے بارے میں کیا جاتا ہے (اور آئندہ بھی ایسے ہی ہو گا) جو معمول کے مطابق ایام حیض سے گزر رہی ہوں۔ لیکن پچھلے دنوں انگلستان میں ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ جس نے قرآن مجید کی بیان کی ہوئی چھ ماہ کی مدت کی مزید تصدیق کر دی۔ اس واقعہ میں حمل کی مدت آخری ایام حیض کی ابتدا سے بچے کی ولادت تک شمار کرنے کی بجائے ایک بچے کی ولادت کے بعد سے دوسرے بچے کی ولادت تک کا دورانیہ مدت حمل کی نشاندہی کرتا ہے۔ روزنامہ جنگ لاہور ۱۸ فروری ۲۰۱۳ء کے شمارے میں دو بچوں کی تصویروں کے ساتھ اس واقعہ کی خبر اس طرح شائع ہوئی۔

''لندن (نیٹ نیوز) لندن میں ایک خاندان کے ہاں دو بچوں کی پیدائش حیرت انگیز طور پر صرف ساڑھے چھ ماہ کے وقفے کے اندر ہوگئی۔ طبی ماہرین نے واقعہ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا ہے کہ مذکورہ واقعہ برطانیہ میں ایک ہی والدین کے ہاں پیدا ہونے والے دو بچوں کے درمیان سب سے کم وقفہ ہے جس نے ماہرین کے علاوہ سننے والوں کو بھی ششدر کر دیا ہے۔ ان دونوں بچوں کو اب آگے پیچھے پیدا ہونے والے جڑواں بچوں کا نام دے دیا گیا ہے کیونکہ دونوں کی پیدائش میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ والدین اور فیملی ذرائع کا کہنا ہے کہ دونوں بہن بھائی صحت مند ہیں اور بالکل عام بچوں کی طرح پرورش پا رہے ہیں۔''

اس واقعہ میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلے بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو دوبارہ بارآور ہونے میں کم سے کم پندرہ دن تو لگے ہی ہوں گے اس طرح حمل کی مدت چھ ماہ ہی رہ جاتی ہے۔ اس طرح جدید سائنسی حقائق سے وہ بات سچ ثابت ہوئی جو قرآن میں آج سے چودہ سو سال پہلے بیان کی گئی۔

(جاری ہے)

☆☆☆

آسیہ راشد

میری امی

آپا ارشاد بتول کی یادیں

ارشاد بتول تمام خاندان کی آپا تھیں مگر صرف میری امی تھیں۔ آج ان کے بارے میں لکھتے ہوئے میرے دل میں ایک گونہ اطمینان کا احساس بھی ہے کہ میں آج اگر کچھ لکھنے کے قابل ہوں تو اللہ کی توفیق کے بعد ان کی وجہ سے ہوں ساتھ ہی دکھ کا احساس بھی شامل ہے کہ وہ آج ہم میں موجود نہیں وہ یقیناً افق کے پار ستاروں کی بستی میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ہمراہ خوش گپیوں میں مصروف ہونگی اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)۔

میری امی کا شمار ان عظیم ماؤں میں ہوتا ہے جو محبت و شفقت کے ساتھ ساتھ صبر، شکر اور عفو و درگزر کا روشن مینار ہوتی ہیں اور جن کا وجود ایک ادارے کی مانند ہوتا ہے ان کی والدہ میری نانی جان حبیب النساء نے خرابیٔ صحت کی وجہ سے گھر کی تمام ذمہ داری انھیں سونپ رکھی تھی۔ انھوں نے والدین کے گھر پر بلا شرکتِ غیر حکومت کی مگر نہایت عاجزی سے انھوں نے ایک گمنام سپاہی کی طرح اپنے فرائض انجام دیے جسے کسی صلے یا انعام کی تمنا نہیں ہوتی صرف اور صرف اپنے کام سے لگن ہوتی ہے۔ انھوں نے ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح زندگی گزاری جس نے اردگرد والوں کو معطر رکھا اور ٹھنڈک اور فرحت بخشی مگر خود کہیں بھی دکھائی نہ دیں۔

امی تو سیدھے سبھاؤ والی عام سی خاتون تھیں انھیں جان محفل بننا نہیں آتا تھا وہ تو محفلوں کو سجانے والوں کی خدمت کے لئے مامور کر دی گئی تھیں۔ میں نے انھیں کبھی شوخ و شنگ کپڑے اعلیٰ جیولری، ہیل والا جوتا عمدہ پرس لیے اور نہ ہی کبھی میک اپ کیے ہوئے دیکھا تھا نہ ہی وہ کسی بھی محفل میں مہمانِ خصوصی کے طور پر دکھائی دیں۔ ہاں البتہ یہ ضرور تھا کہ کپڑوں کے معاملے میں ان کی پسند بہت عمدہ تھی۔ کپڑے سادہ مگر قیمتی ہوتے۔ ایک ہاتھ میں تین سونے کی چوڑیاں مدت سے پہنے ہوئے تھیں جن کا ڈیزائن بدلوانے کی انھوں نے کبھی کوشش نہ کی تھی۔

وہ عمدہ سے عمدہ کھانا پکا کر میز پر رکھ کر یوں منظر سے ہٹ جاتیں کہ کوئی جان نہ لے کہ عمدہ کھانے کس نے بنائے ہیں، سبھی فرمائشیں کرتے اپنی اپنی پسند انھیں بتا کر بے فکر ہو جاتے۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔۔۔ صرف بے لوث خدمت ہی ان کا شعار رہا۔

گھر کے تمام افراد کو وقت پر ہر شے مہیا کرنا گھر کی صفائی ستھرائی، کھانا پکانا، بازار سے کپڑوں کی خریداری، بھائی بہنوں کی شادیاں، سبھی ان کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ بلاشبہ وہ بہترین منتظم تھیں۔

کھانے کے معاملے میں انھوں نے اپنے لیے انوکھا ہی دستور اپنایا ہوا تھا۔ اپنے لیے بہت اچھے کی خواہش کبھی نہ کی۔ جو ملا کھا لیا بتایا کرتی تھیں ان کے سسرال والے زمیندار لوگ تھے وہ اکثر نمک مرچ کے ساتھ روٹی کھا لیتے تھے اس لیے مجھے بھی مشکل نہیں لگتا میں بھی نمک مرچ کے ساتھ بہت سہولت سے روٹی کھا لیتی ہوں۔ وہ آم، خربوزہ، امرود کی چاٹ کے ساتھ بھی بہت شوق سے روٹی کھا لیتی تھیں۔

جماعت اسلامی کی خاموش کارکن تھیں۔ جب کبھی الیکشن آتے تو گھر میں آنے والے ہر شخص کو پرزور طریقے سے جماعت اسلامی کو ووٹ دینے کے لئے قائل کرتیں۔ جماعتی سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر رہتیں۔ دین کے کام کرنے والوں سے دلی محبت رکھتیں۔ اپنی بہن رخشندہ کوکب کی سہیلیوں کا ذکر بہت محبت اور احترام سے کرتیں خصوصاً بنت الاسلام صاحبہ، زہرہ وحید صاحبہ ثریا اسماء صاحبہ کا سب سے زیادہ ذکر میں نے ان سے سنا۔ سوشل کاموں کے سلسلے میں خالہ جان زہرہ وحید صاحبہ جب مجھے پہلی بار اپنے ساتھ لے کر چلیں تو ان کا نام سن کر مجھے فوراً امی سے اجازت مل گئی تو ''تم زہرہ کے ساتھ جا رہی ہو اس لیے مجھے بے فکری ہے''۔

اتنے زیادہ کاموں کے ساتھ میں نے انھیں باقاعدگی سے اخبار اور کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے دیکھا ہے۔ صبح سویرے سب کے جاگنے سے

پہلے وہ اخبار پڑھ چکی ہوتیں۔ملکی وغیر ملکی حالات سے پوری طرح باخبر رہتیں۔ پہلے ریڈیو پھر ٹی وی پر نو بجے کی خبریں ضرور سنتیں۔رات جب سو رہے ہوتے تو میں نے انھیں کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتے دیکھا ہے۔ میں نے اپنی والدہ رخشندہ کوکب پر جو کتاب مرتب کی اس کی راوی امی تھیں۔قرآن کی کہانیاں،الف لیلیٰ کی داستانیں نبیوں کے قصے میں نے بچپن میں ہی امی سے سن لیے تھے۔

پنج وقتہ نماز، روزہ،زکوٰۃ ،تہجد جیسے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ معاملات میں میں نے انھیں بہت محتاط پایا۔ ہر کسی سے صلح،صفائی کسی کا برا نہ چاہنا،خلوص دل سے ہر ایک کے کام آنا انہی پر ختم تھا۔ان کا خدمت و ایثار کا رویہ صرف گھر والوں تک محدود نہ تھا بلکہ پورا خاندان ان کے احسانات کا مرہون منت رہا۔جس کسی کے گھر میں شادی بیاہ کا معاملہ ہوتا یا زچگی کی مصروفیات یا کوئی اور معاملہ آپا ارشاد کو یاد کیا جاتا ان سے مشورے لیے جاتے ان سے مدد چاہی جاتی وہ سب کی امیدوں پر پورا اترتیں۔میں اکثر ان کے بارے میں سوچتی کہ اگر انھیں تعلیم حاصل کرنے کے بہترین مواقع ملے ہوتے اور گھر کا ماحول انھیں باہر کام کرنے کی اجازت دیتا تو یقیناً معاشرے میں ان کا نمایاں مقام ہوتا۔

انھوں نے اپنے گھر کے قریب ایک سلائی سکول کی بھی بنیاد رکھی۔ جس میں بہت سی لڑکیاں ان سے سلائی سیکھنے آتیں، کپڑوں کی سلائی، مشینی کڑھائی، مٹنگ میں وہ بے حد ماہر تھیں۔ بچوں کے فراک، نیکر، شرٹ، لیڈیز و مردانہ سوٹ کے علاوہ مردانہ پینٹ کوٹ بھی بہت عمدہ سی لیتی تھیں۔ انھوں نے مشینی کڑھائی سے اتنی عمدہ اشیاء تیار کیں کہ انھیں اگر آج کسی نمائش کا حصہ بنا دیا جائے تو یقیناً اول انعام کی حقدار پائیں۔یوں تو ان کی تیار کردہ تمام اشیاء ہی قابل دید ہیں مگر ایک سینری کا ذکر میں خصوصا کروں گی جسے ڈرائنگ روم کی سینٹر ٹیبل کے شیشے میں جڑوایا گیا جس سے میز کا حسن دوبالا ہو گیا وہ میزیں ان کی چھوٹی بہن مسرت افزاء کی شادی کے موقع پر ان کے جہیز میں دی گئیں۔اپنے بھائی مظہر قیوم کی شادی کا عروسی جوڑا خود ڈیزائن کر کے دیا۔سنہری رنگ پر سنہری باریک تلے دبکے باریک کناری اور موتیوں کا کام عجب بہار دکھلا رہا تھا ایسا عمدہ جوڑا تیار ہوا کہ دیکھنے والے ہاتھ لگا لگا کر دیکھتے کہ یہ جوڑا کہاں سے تیار کروایا۔ پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ان کی بھابھی نے وہ جوڑا سنبھال کر رکھا ہے اور اس کی چمک دمک آج بھی اسی طرح برقرار ہے۔

وہ نہ صرف گھر کے ہر محاذ پر کامیاب و کامران رہیں بلکہ قیام پاکستان کے وقت انھوں نے ہر ممکن حد تک کام کیا۔جن دنوں پاکستان بنا ان کے والد میاں نجم الدین صاحب کی پوسٹنگ شیخوپورہ میں تھی۔مسلم لیگ نے اعلان کیا کہ تمام مسلمان گھرانے مسلم لیگ کے جھنڈے اپنے گھروں پر لگائیں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ یہاں کتنے مسلمان گھرانے آباد ہیں اور مسلمانوں کی قوت کا اظہار ہو۔امی نے اپنی کالونی کے تمام گھروں کے لئے پرچم سیئے ۔دو تین دن لگا کر پرچم تیار ہو گئے۔اگلے روز تمام کالونی کے مسلم گھرانوں پر ان کے ہاتھ کے سلے ہوئے پرچم لہرا رہے تھے۔

شیخوپورہ کلب میں جا کر مختلف سرگرمیوں میں حصہ لینا،خواتین کو جمع کر کے درس سننے کے لئے تیار کرنا انہی کا کام تھا۔درس دینے کا سلسلہ ان کی بہن رخشندہ کوکب نے شروع کیا۔

پارٹیشن کے بعد جب تمام مہاجرین لٹی پٹی حالت میں پاکستان پہنچ رہے تھے اس وقت انھیں کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ ساتھ کپڑوں کی بھی بے حد ضرورت تھی۔ان کے والد صاحب انھیں کپڑوں کے تھان لا کر دیتے کہ مہاجرین کے لئے لباس تیار کر دیں۔ان کی چھوٹی بہنیں منور سلطانہ (رخشندہ کوکب) اور نسیم اختر کپڑوں کی کٹنگ کر دیتیں اور امی تمام رات بیٹھ کر کپڑے سیتی رہتیں تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی بروقت ضرورت پوری ہو سکے۔

میری امی رخشندہ کوکب کی وفات کے بعد جب انھیں میری ذمہ داری اٹھانی پڑی تو انھوں نے بقایا کاموں کی طرح اپنی پوری توجہ مجھ پر مرکوز کر دی۔میں نے جب ہوش سنبھالا تو ایک بے حد مشفق اور محبت کرنے والی ہستی کو ہر دم اپنے پاس موجود پایا جو سائے کی طرح ہر آن میرے پاس ہوتیں،میری ہر ضرورت کو بھاگ بھاگ کر پورا کرتیں۔

مجھے اپنی کوئی خواہش یاد نہیں جو میں نے کی ہو اور وہ پوری نہ ہوئی ہو مگر ان کی محبت و شفقت میں ہمیشہ ایک خط کھنچا ہوتا جو میری بے جا ضدوں کو نہ

ماننے والا خط تھا جس کو پار کرنے کی کوئی گنجائش موجود نہ تھی اور وہ خط تھا حدود کا۔ صرف جائز خواہشات پوری کی جاتیں۔ جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی شامل ہوتی ادھر سے صاف انکار مل جاتا۔

جب میں اپنے ماضی پر نگاہ دوڑاتی ہوں تو مجھے فجر کے وقت ان کا جگانا یاد آجاتا ہے۔ نہایت محبت سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ روزانہ پرسوز الفاظ میں یہ شعر گنگاتیں

جاگنا ہے جاگ لے افلاک کے سائے تلے
حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سائے تلے

جب تک میں اٹھ نہ جاتی میرے سرہانے موجود رہتیں۔ اللہ سے محبت، اللہ کا خوف، اللہ کا کہا ماننا، اس کی نافرمانی سے بچنا، نماز کی پابندی کرنا، ہمیشہ سچ بولنا، جھوٹ سے بچنا یہ تمام اسباق بچپن سے ہی ازبر کروادیے گئے تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے انھوں نے مجھے کہا ''زندگی میں ہمیشہ سچائی کے راستے کو اپنانا اگر کوئی تمہاری گردن پر تلوار بھی رکھ دے تو جھوٹ کبھی نہ بولنا''۔

نماز کے بارے میں بے حد متفکر رہتیں میں بعض اوقات ان کے بار بار کہنے سے جھنجھلا اٹھتی۔ ایک بار میں نے ان سے کہا ''امی آپ کیا ہر وقت نماز کے لئے تلوار ہاتھ میں لیے کھڑی رہتی ہیں ابھی بہت وقت ہے پڑھ لوں گی''۔ تو انھوں نے میری گستاخی کو نظر انداز کرتے ہوئے نہایت محبت سے کہا ''جانتی ہو میں ایسا کیوں کرتی ہوں کیوں کہ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں اور اپنے پیاروں کو کوئی آگ کا ایندھن بنتے نہیں دیکھ سکتا''۔

یہ کیسی محبت تھی جس کا ہر سرا اللہ کے لئے شروع ہوتا اور اللہ ہی پر ختم ہو جاتا۔ جب میں اپنی ضدوں کو پورا ہوتا نہ دیکھ پاتی تو منہ بسور کر بیٹھ جاتی تو وہ مجھے سمجھاتیں۔ ''دیکھو بیٹا رونا اچھی بات نہیں رونے والوں کے ساتھ کوئی نہیں روتا ہنسنے والوں کے ساتھ سبھی ہنستے ہیں''۔

اپنی یادداشتوں پر میں جتنا چاہے زور دے ڈالوں مجھے نہیں یاد پڑتا کہ انھوں نے مجھے کبھی ڈانٹا ہو یا مارا ہو۔ انھوں نے مجھے کبھی محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ ماں کی محرومی کیا ہوتی ہے۔ بے پناہ شفقت ہی شفقت، محبت ہی محبت، پیار ہی پیار، دلار ہی دلار۔

ماں جو تڑپے تو رگِ سنگ سے شبنم پھوٹے
آگ میں پھول کھلیں، خاک سے زمزم پھوٹے
راستہ بند جو ہو ماں کی دعاؤں سے کھلے
ماں کے اشکوں سے مرا نامۂ اعمال دھلے

زندگی کے بارے میں ان کا اپنا ہی فلسفہ تھا انھیں ہمیشہ میرے ساتھ رہنا اچھا لگتا۔ وہ اپنی بیٹی فرخندہ کے پاس تین چار روز سے زیادہ نہ رہ پاتیں اور اپنے گھر واپس آجاتیں۔ باجی اور ان کے بچے چاہے کتنا ہی اصرار کیوں نہ کریں وہ واپسی کے لئے بضد رہتیں۔ وہ کہا کرتی تھیں جب تک پتھر اپنی جگہ پر پڑا رہتا ہے چٹان کہلاتا ہے اگر وہ اپنی جگہ چھوڑ دے تو پتھر کی طرح لڑھکتا چلا جاتا ہے۔

ماں کا لفظ اپنے اندر لا متناہی خوشبوئیں، چھاؤں اور سکون سمیٹے ہوتا ہے۔ یونہی تو نہیں کہا جاتا ''ماواں ٹھنڈیاں چھاواں'' وہ نہ صرف میری امی تھیں بلکہ میرے بچوں کی پرورش بھی انھی کے ہاتھوں میں ہوئی میری زندگی کے تمام سرد و گرم میں وہ ہمیشہ میرے سامنے ڈھال بن کر کھڑی رہیں۔

میرے گھر میں ہمیشہ ان کے وجود سے رونق اور خیر و برکت رہی۔ خاندان کے سبھی افراد امی جان کو ملنے کے لئے بلا تکلف ہمارے گھر آتے اور دیر تک بیٹھتے، بلا تکلف کھاتے پیتے جیسے خاندان میں کوئی ایک بڑا گھر ہوتا ہے اسی طرح میرے گھر کو یہ اعزاز حاصل رہا۔ عید بقر عید پر سبھی لوگ عید کی نماز پڑھ کر سب سے پہلے ہمارے گھر امی جان کو ملنے کے لئے آتے۔ میں ہر عید پر علی الصبح اٹھ کر آنے والے مہمانوں کی تواضع کے لئے تیاری میں لگ جاتی کیونکہ آٹھ بجے سبھی لوگ ہمارے گھر موجود ہوتے امی کے بہن بھائیوں کے بچے بھی اس طرح ہمارے ہاں آکر خوشی محسوس کرتے جیسے نانی امی کے گھر جا کر بچے خوش ہوتے ہیں۔

اور پھر اتنی متحرک اور فعال خاتون کو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی بھٹی میں ڈال دیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ جنوری کا مہینہ تھا جب فجر کے وقت وہ نماز کے لئے اٹھیں تو فالج نے ان کے جسم کے بائیں حصے کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ ان کا بایاں بازو ٹانگ اور چہرہ بری طرح متاثر ہوا تھا انھیں ہسپتال لے گئے ڈاکٹر کے مطابق اگلے چوبیس گھنٹے بے احد اہم تھے۔ مگر اگلے ہی روز وہ

اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر بستر سے اٹھ بیٹھیں۔صبح جب ڈاکٹر راؤنڈ پر آئیں تو دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ مریضہ بستر کی بجائے کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی ہیں یہ ان کی قوت ارادی تھی جس نے انھیں بستر سے دور رکھا اور وہ کئی برس تک اپنے آپ کو سنبھالے رہیں۔

مگر وقت کے ساتھ ساتھ انسان کمزور سے کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔وہ جنہوں نے کبھی کسی سے خدمت نہیں لی تھی اب دوسروں کی محتاج ہو چکی تھیں مگر ان کی قوت ارادی ایک بار پھر ان کے کام آئی اور انھوں نے چھڑی پکڑ کر چلنا سیکھ لیا۔وہ نہایت بلند حوصلہ اور اعلیٰ ظرف کی مالک تھیں مزاج میں صبر کی آزمائش نے انھیں اس مشکل دور سے باآسانی گزار دیا۔

اور پھر ان کی ساعت آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی گئی۔خاندان کے سبھی لوگ ان کی ساعت کی وجہ سے ان سے بات چیت کرنے سے گھبراتے پورے خاندان میں صرف میری خالہ نسیم اختر جو راشد صاحب کی والدہ تھیں (اللہ انھیں غریق رحمت کرے) وہی تھیں جو امی کو پوری توجہ اور اہمیت دیتیں وہ جب بھی ان سے ملنے آتیں نہایت عزت واحترام سے انھیں پاس بٹھاتیں اور لکھ کر ان سے ساری باتیں کرتیں۔

تمام خاندان والوں کے حال احوال تفصیل سے انھیں بتاتیں۔ہمیشہ کہتیں ہم خود تو والدین کی عزت کرتے ہی ہیں دوسروں کی نظروں میں والدین کو احترام دینے کے لئے انھیں وی آئی پی پروٹوکول دینا چاہیے اس سے ہماری اپنی عزت میں اضافہ کے ساتھ والدین کے وقار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔جب بھی کسی دعوت پر جانا ہوتا تو ہمیشہ اصرار سے کہتیں کہ آپا کو ساتھ لے کر آنا۔

امی کبھی بھی کسی انسان سے نہ ڈریں نہ دبیں اگر ڈر تھا تو اللہ کا تھا جب تمام اعزا اقربا جمع ہوتے تو ایک ہی بات کرتیں آپ سب مجھے معاف کر دیں کسی کے ساتھ اگر زیادتی ہوگئی ہے تو وہ بھی مجھے بخش دے اگر میں نے کسی کا کچھ دینا ہے تو وہ مجھے بتادے تاکہ قرض میرے سر سے اترے۔

آخری سالوں میں مجھے باجی کہہ کر بلانا شروع ہوگئی تھیں میں انھیں کہتی آپ مجھے نام لے کر بلایا کریں تو کہتیں تم میرے سب کام کرتی ہو تم میری باجی ہو۔میں نے تمہیں بہت تنگ کیا ہوا ہے مجھے معاف کر دینا تو میں رو پڑتی کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں غلطیاں تو بچوں سے ہوتی ہیں معافی تو مجھے آپ سے مانگنی چاہیے۔میری غلطیوں کے انبار پہاڑ برابر ہو چکے ہیں آپ مجھے معاف کر دیں مگر وہ اپنی بات پر قائم رہتیں کہ سب مجھے معاف کر دیں۔

انہی دنوں میرے بیٹے نے خواب میں دیکھا جیسے وہ حرم کعبہ میں کھڑا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ خانہ کعبہ کے عین اوپر ایک بہت اونچا مینار ہے جس کے گرد لوگ طواف کر رہے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ آپا بھی اس مینار کا طواف کر رہی ہیں۔وہ لوگ آپا کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔

بیٹے نے جب خواب مجھے سنایا تو میں حیرت زدہ رہ گئی میں نے اس سے پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے کہ خانہ کعبہ کے عین اوپر ایک اور خانہ کعبہ ہے جسے بیت المعمور کہتے ہیں اور اس کے گرد فرشتے طواف کرتے ہیں۔اس نے کہا مجھے نہیں معلوم۔تو میں نے کہا تم نے بیت المعمور کے فرشتوں کے ساتھ آپا کو طواف کرتے دیکھا ہے۔میں یہ خواب سن کر اندر سے ڈر سی گئی تھی۔کیا امی اللہ تعالیٰ کے خاص مقربین میں شامل ہو چکی تھیں اور ہمیں اس کا ادراک نہیں تھا۔

ان کی زندگی میں اب صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا۔نماز،نماز اور بس نماز۔اور پھر وہ نماز بھولنے لگیں جس کا انہیں بے حد قلق تھا۔نماز کی فکر نے انھیں بہت رلایا۔بعض اوقات روتے روتے ہچکی بندھ جاتی کہ میں نماز بھول گئی ہوں نہ جانے میرا کیا انجام ہوگا۔میرے بیٹے عمار نے ان کی یہ مشکل حل کر دی اس نے پانچوں نمازیں پرنٹ کروا کر الگ الگ کاپیوں کی شکل میں تیار کر دیں وہ ہر نماز کے وقت اس کاپی کو کھول کر سامنے رکھ لیتیں اور دیکھ دیکھ کر نماز پڑھتی رہتیں پھر ان کی تسلی نہ ہوتی حتیٰ کہ دوسری نماز کا وقت آن پہنچتا۔

انھیں نماز کے لئے روتے دیکھ کر مجھے حضرت ابراہیم ادھم کا واقعہ یاد آجاتا کہ ایک بار شیطان نے انھیں اتنی نمازیں پڑھتے اور عبادت کرتے دیکھ کر سوچا کہ کیوں نہ میں ان کی نمازیں قضا کروادوں تاکہ ان کی عبادت میں کچھ نہ کچھ تو کمی واقع ہو جائے اس نے عین نماز کے وقت انھیں خوب گہری نیند سلا دیا۔جب وہ جاگے تو وقت نماز جا چکا تھا۔انھیں نماز کے قضا ہونے

کا اتنا رنج ہوا کہ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ روتے جاتے اور اللہ سے استغفار کرتے جاتے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ اس نے ان کے درجات بلند کر دیے اور انھیں اپنے پسندیدہ بندوں میں شامل کر لیا۔ جس پر شیطان بہت پریشان ہوا اور اس نے اگلے روز انھیں خود نماز کے لئے جگانا شروع کر دیا تا کہ ان کے مزید درجات بلند نہ ہو جائیں۔

مجھے امی کی خدمت کے لئے مستقل طور پر ایک مددگار کی ضرورت تھی کیونکہ یہ کام میں اکیلی نہ کر سکتی تھی۔ اس سلسلے میں مجھے اکثر و بیشتر ملازمہ کی تلاش رہتی۔ میں ہر رشتہ دار اور جاننے والوں سے اکثر اس سلسلے میں مدد کی طلب گار رہتی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ تقریباً ایک ماہ تک کسی ملازمہ کا بندوبست نہ ہو سکا۔ میں اپنی مدد کے لئے اپنی بیٹی عینی کو بلا لیتی عینی بھی آخر کتنے دن تک میرے پاس رہ سکتی تھی۔ مجھے لگا میں شاید خود بیمار پڑ جاؤں گی۔ میں نے اس روز اللہ تعالیٰ کو بڑے درد سے پکارا، یا اللہ اگر تو نے ذمہ داری ڈالی ہے تو مددگار بھی بھیج۔ میں اپنی حد تک جہاں تک ممکن ہے جس قدر ہمت ہے ان کے لئے اپنی تمام سعی کر چکی ہوں اب اگلا تیرا کام ہے۔ یہ دعا کر کے میں بے فکر ہو کر لیٹ گئی اب سارا معاملہ میں نے اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ اللہ کا کرنا کیا ہوا اگلے ہی روز ملازمہ کا بندوبست ہو گیا اس رب رحیم نے مجھ ناچیز کی دعا سن لی تھی اور امی کی وفات تک مجھے ملازمہ کے حصول کے لئے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ ایک کے بعد دوسری ملازمہ بہت آسانی سے مل جاتی۔

پھر ایک روز امی کی طبیعت خراب ہو گئی انھیں ہسپتال لے جانا پڑا امی کو ہسپتال میں دیکھ کر مجھے لگتا تھا جیسے میرا دل شق ہو جائے گا یا اللہ میری امی کو شفائے عاملہ و کاملہ عطا فرما میں نے اس رب رحیم کون و مکاں کے والی کو پکارا وہی تو ہے جس کے آگے ہاتھ پھیلا کر میرے تمام مسئلے میری تمام پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں اسی رب نے میرے کرب کا مداوا کرنا تھا اسی نے میرے کشکول میں بھیک ڈالنی تھی وہی تو ہے جس نے میرے اشکوں کو ضائع ہونے سے بچا لینا تھا میں ہسپتال کے برآمدوں پر چلتے پھرتے اپنے آنسوؤں کو پیتے اپنے رب سے فریاد کرتی رہتی پھر مجھے لگا میری دعائیں درِ قبولیت پر دستک دے رہی ہیں۔ امی کی حالت بہتر ہونے لگی۔

پھر ہسپتال میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ امی آئی سی یو وارڈ مین بیڈ نمبر ایک پر تھیں ہم سب ان کے گرد کھڑے تھے ڈاکٹرز ہمیں کہہ رہے تھے آپ ان کے پاس بیٹھ کر قرآن پڑھیں۔ ہم امید اور نا امیدی کے درمیان لٹکے ہوئے تھے کہ امی نے نیند کی حالت میں ہلکے ہلکے ہنسنا شروع کر دیا۔ جس طرح ایک دو ماہ کا بچہ نیند کی حالت میں ہنستا ہے، کھلکھلاتا ہے بعینہٖ یہی کیفیت تھی۔ تمام ڈاکٹرز اور سٹاف بھی ان کے بیڈ کے گرد جمع ہو گئے۔ ہم سب حیران تھے۔ کیا وہ خواب میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں دیکھ رہی ہیں؟ کیا انھیں جنت کے باغات، پھلوں اور نہروں کی سیر کروائی جا رہی ہے یا اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کی خوشی ہے یا کہ وہ نعمتیں انھیں دکھائی جا رہی ہیں جو دنیا کی تکلیفوں کے بدلے میں ان کے حصے میں لکھ دی گئی ہیں۔ وہ دس منٹ تک اسی کیفیت میں رہیں اور اس کے بعد وہ سو گئیں۔

پھر اس سمیع و بصیر، علیم و خبیر نے اپنی رحمت روؤفی سے میری دعاؤں کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے انھیں ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹا دیا تھا یہ ان کے لئے بہتر تھا یا نہیں مگر مجھے تسلی ضرور تھی۔ اور اگلے روز ڈاکٹرز نے ہمیں انہیں گھر لے جانے کی اجازت دے دی۔ میں ان سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس روز خواب میں انھوں نے کیا دیکھا مگر وہ تو گھر آنے کے بعد مکمل طور پر ہم سے بیگانہ ہو گئی تھیں زبان پر جیسے مہر لگ گئی تھی کبھی کبھار کوئی لفظ سننے کو مل جاتا تو وہ ''نماز'' کا لفظ تھا یا ''سبحان اللہ'' واحد لفظ تھا جو وہ ہر کسی کو بلاتے ہوئے ادا کرتیں۔

پھر ان دنوں عجیب سی باتیں ہونے لگیں میں کسی چیز کے بارے میں سوچتی اور میری دعا پوری ہو جاتی میں اللہ تعالیٰ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ ناچیز گنہگار بندی کی بے تحاشا دعائیں قبول کیں مگر ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ صرف سوچا ہو اور خواہش پوری ہو جائے۔ میں سوچتی کہ مجھ میں تو ایسی کوئی خوبی نہیں پھر میرا رب صرف میرے چاہنے سے ہی مجھے نواز رہا ہے۔ ایک روز میں امی کے پاس بیٹھی اسی سوچ میں غلطاں تھی کہ امی نے مجھے آواز دی۔ میں نے چونک کر امی کو دیکھا اور یہ راز جان لیا کہ بستر پر لیٹی میری ماں ہیں جو دھڑا دھڑ میری دعائیں قبول کروا رہی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا

کرم اوراس کی نوازشات انہی کے دم سے ہیں۔

میں نے جب رب رحیم کی مہربانیاں دیکھیں تو مجھے فی الفور ادراک ہوا کہ امی یقیناً اللہ تعالیٰ کے مقربین میں شامل ہو چکی تھیں۔ اللہ کی جس بندی نے کئی سال تک نہ کسی کی برائی کی اور نہ ہی سنی، نہ اپنی زبان سے کسی کو دکھ دیا اور نہ ہی کسی برے کام میں شامل ہوئیں، جنہوں نے اتنے برس صرف اور صرف نمازیں پڑھیں، صبر سے اپنی اس آزمائش پر پورا اتریں اور اب تو زبان پر صرف ایک ہی لفظ تھا سبحان اللہ تو کیسے نہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے قریب کر لیتا۔ میں نے اپنے بچوں سے کہا آپا پارس بن چکی ہیں اگر تم لوگ دنیا اور آخرت میں کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو انکی خدمت کر لو۔ بچوں نے پوچھا پارس کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا پارس ایسی دھات ہے جس کے بارے میں مثل مشہور ہے کہ جو اس کو چھو لے گا وہ سونے کا بن جائے گا۔ پھر میں نے دیکھا میرے تمام بچوں نے پارس سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ خصوصاً باجی فرخندہ کے بیٹے عثمان نے دل و جان سے ان کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھا۔ اس نے ان کے علاج معالجے پر پانی کی طرح پیسہ بہا دیا بیٹا ہونے کا صحیح حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر دے۔ مگر ہونا تو وہی ہوتا ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔

ایک بار میں نے کسی سے ان کی معذوری کا ذکر کیا تو انھوں نے مجھے کہا کہ ان کی اس آزمائش سے اللہ تعالیٰ کسی کی دنیا سنوار رہا ہے اور کسی کی آخرت سنور رہی ہے تم کیوں فکر کرتی ہو؟

21 فروری 2013ء کو ان کی طبیعت پھر اچانک بگڑ گئی ہم انھیں ہسپتال لے گئے ڈاکٹرز نے مایوسی کا اظہار کیا مگر میں ہمیشہ کی طرح پرامید تھی پہلے دو بار ان کی ایسی حالت ہو چکی تھی اور وہ صحت یاب ہو کر گھر آ چکی تھیں مگر اب تو ان کے پورے وجود پر بیگانگی کی کیفیت طاری تھی ویسے تو انھوں نے کافی عرصہ پہلے دنیا سے منہ موڑ لیا تھا مگر اب تو ان کی آنکھوں میں بھی بیگانگی تھی جیسے کوئی اجنبی ہو۔

میں نے اپنی بیٹی عینی اور داماد عثمان جو آج کل مسقط میں رہائش پذیر ہیں انھیں فون کر دیا کہ ڈاکٹرز نے جواب دے دیا ہے آپ لوگ فوراً پاکستان آ جائیں۔ عینی اور عثمان جو ہر ہر لمحے ہم سے رابطے میں تھے اور آنے کے لئے بے چین تھے فوری طور پر اطلاع ملتے ہی پہنچ گئے۔ میرا بیٹا عمار جو آسٹریلیا میں مقیم ہے اسے بھی راشد صاحب نے بلا لیا اور وہ بھی ان کے جنازے کو کندھا دینے اور آخری دیدار کرنے پہنچ گیا یہ سب بندوبست میرے رب کریم نے کیا جو بڑا مہربان ہے۔

اللہ رب العالمین کی جانب سے ۱۸ ربیع الثانی یکم مارچ 2013 بروز جمعۃ المبارک ان کی دنیا سے رخصتی کا دن طے ہوا تھا۔

دوپہر ایک بجے کے قریب میں اور عینی ہسپتال کے کمرے میں امی کے پاس موجود تھے کہ مجھے کمرے میں خوشبو کا احساس ہوا۔ میں نے یکدم پلٹ کر امی کی طرف دیکھا ان کی سانس تیز تیز چل رہی تھی میرا دل زور سے دھڑکا، کیا کچھ ہونے والا ہے۔۔۔ میں نے عینی سے کہا کیا تم کمرے میں خوشبو محسوس کر رہی ہو؟ اس نے چند لمحے کے لئے حیرانی سے مجھے دیکھا اور ظہر کی نماز کی نیت باندھ لی۔ تقریباً ڈیڑھ بجے سینئر ڈاکٹرز کمرے میں آئے انھوں نے امی کا چیک اپ کیا اور چند قدم بیڈ سے ہٹ کر ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے قدرے توقف کے بعد بولے آپ ان کے پاس بیٹھ کر قرآن پڑھیں ان کے پاس وقت بہت کم ہے تب پہلی بار مجھے لگا کہ امی کا وقت رخصت آن پہنچا ہے۔

میں نے عینی سے کہا مجھے لگتا ہے نیک روحیں انھیں لے جانے کے لئے کمرے میں جمع ہو رہی ہیں فرشتے آ چکے ہیں دنیا سے ان کا رزق اٹھ چکا، تھوڑی دیر پہلے اینجی کے ذریعے دی جانے والی خوراک نے اندر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ کمرے میں گویا اجل کے فرشتوں کے قدموں کی چاپ محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے عینی سے کہا گھر میں سب کو فون کر دو کہ وہ آ جائیں نہ جانے مجھے کیسے یقین تھا کہ امی کی رخصتی جمعہ کے روز اور موسم بہار میں ہو گی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ سے بہت دعا کرتی تھیں کہ یا اللہ مجھے جمعہ کے روز اپنے پاس بلانا۔ جمعے کی خشوع و خضوع سے تیاری کرنے والی اپنے رب سے ملنے کی مشتاق دنیا سے جانے کو تیار بیٹھی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں باجی فرخندہ اور ان کے تینوں بچے لقمان، عثمان اور ارم اور میرا بیٹا اسامہ ہسپتال پہنچ چکے تھے۔

کیا امی کی رخصتی کا وقت آن پہنچا ہے؟ یہ سوچتے ہی میرا دل مٹھی میں

آ گیا، میری آنکھیں نم ہونے لگیں میرے قدم من من کے ہو گئے آنکھوں کے گرد جیسے دھندسی چھا گئی میں اونچی آواز میں کلمہ پڑھنے لگی۔ پھر میری آواز رندھ گئی میں رندھی ہوئی آواز میں کلمہ پڑھتی جاتی اور میری آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔

ابھی چار بجنے میں دس منٹ تھے۔ باہر موذن نے عصر کی اذان دی میں نے امی کی آنکھوں میں دیکھا۔ زندگی کی جوت ختم ہو چکی تھی۔

تھکا ہارا مسافر اپنی منزل کی طرف لوٹ چکا تھا ان کی روح قفس عنصری سے اس طرح پرسکون طریقے سے پرواز کر گئی کہ ان کا سر اپنے پیارے نواسے عثمان کے ہاتھوں میں تھا۔ دیے بجھ چکے تھے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

روح کے پرواز کرتے ہی جیسے ہوا میں یکدم خوشبوئیں پھیل گئیں ہم سب ایک دوسرے کے چہرے تکنے لگے میں نے باجی سے پوچھا کیا آپ کو کوئی خوشبو آ رہی ہے تو وہ بولیں میں بھی یہی پوچھنے والی تھی پھر ہم سبھی ان خوشبوؤں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عنبر اور لوبان کی خوشبو گلاب اور موتیے کی خوشبو سے کمرہ معطر ہو رہا تھا ہم سب سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ میری نگاہوں کے سامنے رسول ﷺ کی وہ حدیث مبارکہ آ گئی جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا نیک روحوں کے لئے سبز رنگ کا معطر کفن بھیجا جاتا ہے کیا یہ وہی خوشبوئیں تھیں، کیا وہ سبز کفن آ چکا ہے جس میں ان کی روح کو لپیٹا جا رہا ہے؟ یہ وہی لمحات تھے یہ ساری کارروائی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھی مگر اس کا ایک حصہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دکھا دیا تھا کہ نیک روح خوشبوؤں کے جلو میں اگلی دنیا کو روانہ ہو رہی ہے۔

میری امی آج اجل کے گہوارے میں محو استراحت ہیں۔ آج ان کا لباس سفید رنگ کا ہے ان کا چہرہ غموں سے بے نیاز ہے۔ بے شمار بھیگی آنکھیں ان کو بڑی عقیدت سے دیکھ رہی ہیں۔ لوگوں کا ایک سمندر ہے جو ان کے گرد جمع ہے جن کی سسکیاں ہوا میں نوحے بکھیرتی محسوس ہو رہی ہیں اور امی ہم سب سے بے نیاز اپنی دلکش منزل پر پہنچنے کو بے تاب ہیں۔ وہ جاتے جاتے مجھے آگہی کے بہت سے اسباق دے گئی ہیں جنہیں سمجھنا اور سمجھانا اب میرا کام ہے۔

جو کچھ انھوں نے میرے لیے کیا میں ان کے لئے نہیں کر سکتی تھی۔ میں تو ان کے ایک رات جاگنے کا بھی حق ادا نہیں کر سکتی۔ مجھے سب کہتے ہیں تم نے امی کی بہت خدمت کی، مجھے معلوم نہیں خدمت کرنا کیا ہوتا ہے میں تو صرف روزمرہ کے معاملات نپٹایا کرتی تھی۔ نہلایا دھلایا کپڑے بدلوائے کھانا کھلایا یا نگرانی کی، کرسی پر بٹھا دیا اور بس وہ تھیں اور ان کی تنہائی تھی۔ کاش میں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ان کے سامنے بیٹھی رہتی مگر میں تو مصروف ہی بہت تھی۔ ان کی زندگی میں مجھے احساس نہ تھا کہ میں جی بھر کر ان کی خدمت کر لوں لیکن اب میں سوچتی ہوں اگر احساس ہو بھی جاتا تو میں کچھ نہ کرتی، اب بھی اگرچہ بہت سی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے مگر ہم کچھ نہیں کر پاتے صرف سوچتے رہ جاتے ہیں۔

مجھے پوری امید ہے آپ نے ضرور میری کمیوں کوتاہیوں کو معاف کر دیا ہوگا میری لاپروائیوں کو نظر انداز کر دیا ہوگا آپ نے یقیناً ہمارے لیے بہت سی دعائیں کی ہیں جس کے لئے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ ہمیں دنیا میں بھی کامیابیاں چاہئیں اور آخرت میں بھی خصوصاً جنت میں آپ کا ساتھ چاہیے۔

میرا تو قرآن کی اس آیت پر ایمان ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد بھی کسی درجہ ایمان میں ان کے نقشِ قدم پر چلی ہے ان کی اس اولاد کو بھی ہم جنت میں ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل میں کوئی گھاٹا نہ انکو دیں گے'' (سورۃ طور ۵۲)۔

پس میں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے اور میرے بچوں کو جنت الفردوس میں امی اور میرے والدین کے ساتھ ملائے اور ہم سب کو ان کے لئے صدقہ جاریہ بنائے (آمین)۔

☆☆☆

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا

خاموشی کی فضیلت

چونکہ زبان کے قابو نہ ہونے کے باعث انسان طرح طرح کے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لیے اربابِ عقل و دانش نے جہاں ایک طرف زبان کی حفاظت کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں دوسری طرف خاموشی کی فضیلت بھی بیان کر دی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان جتنا کم بولے گا، غلط باتیں کر جانے کا امکان بھی اتنا ہی کم ہوگا۔ خاموشی کی فضیلت سے یہ مراد نہیں کہ انسان ضرورت کے وقت بھی نہ بولے کیونکہ جیسے بہت سے گناہ کے کام زبان سے کیے جاتے ہیں ایسے ہی بہت سے ثواب کے کام بھی تو زبان ہی سے سرانجام دیے جاتے ہیں۔ مثلاً کسی کو سیدھی راہ دکھانا، کسی غمزدہ کی دلجوئی کرنا، قرآن پاک کی درس و تدریس کرنا وغیرہ وغیرہ۔ خاموشی کی تعریف کرنے سے درحقیقت یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ زبان کو بے ضرورت نہ کھولنا بہت سے خطرات سے بچ جانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو خاموش رہا وہ نجات پا گیا۔ (ترمذی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ اپنے ہمسائے کو تکلیف نہ دے اور جو شخص خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی خاطر داری کرے اور جو شخص خدا اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اسے چاہیے کہ بھلی بات کہے یا پھر خاموش رہے۔ (مسلم)

عمران بن حطان بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابوذرؓ کے پاس آیا تو میں نے انھیں مسجد میں کالی کملی لپیٹے تنہا بیٹھے دیکھا۔ میں نے عرض کیا کہ اے ابوذرؓ، یہ تنہائی کیسی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ برے ہم نشین سے تنہائی بہتر ہے اور نیک ہم نشین تنہائی سے بہتر ہے اور اچھی بات بتانا خاموشی سے بہتر ہے اور بری بات بتانے سے خاموشی بہتر ہے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے ذکر کے سوا کسی اور کلام کی کثرت نہ کرو کیونکہ اللہ کے ذکر کے سوا کسی اور کلام کی کثرت دل کو سخت کر دیتی ہے اور اللہ سے سب سے زیادہ دور وہ شخص ہوتا ہے جو سخت دل ہو۔ (ترمذی)

مفید اور ضروری گفتگو

جہاں بات کرنا ضروری ہو وہاں خاموشی اختیار کر لینا مداہنت کہلائے گا۔ کچھ باتیں کامیابی اور اعلیٰ درجات کے حصول کے لیے ضروری ہیں۔ زبان سے اللہ کے ذکر کے کلمات ادا کرنا اعلیٰ درجات کے حصول کے لیے لازم ہے۔

زبان سے اللہ کا ذکر:

اللہ رب العزت اپنے محبوب بندوں کی صفات بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وہ لوگ اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔'' (آل عمران ۱۹۱)

اللہ کے ذکر کو کامیابی اور فلاح قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

''اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔'' (الجمعہ ۱۰)

اللہ کے ذکر سے دلوں کو سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اور جب بندہ اپنے رب کو یاد کرتا ہے تو اللہ رب العزت خود اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرۃ ۱۵۲)

''پس تم مجھے یاد کرو میں تمھیں یاد کروں گا۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود:

زبان سے درود و سلام کے الفاظ کی ادائیگی ایک ایسا عظیم الشان کام ہے جس کے ذریعے اللہ رب العزت اور فرشتوں کی ہمنوائی نصیب ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود و سلام بھیجا کرو۔'' (الاحزاب ۵۶)

درود پڑھنے والا اللہ کی رحمتوں کا مستحق بن جاتا ہے۔ جب تک وہ درود پڑھتا رہتا ہے اس پر دس گناہ رحمتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے۔

تلاوتِ قرآن پاک:

تلاوتِ قرآن مجید بذات خود ذکر اللہ ہے۔ قرآن سے شغف رکھنے والا بندہ قیامت کے روز قرآن کی سفارش کا مستحق قرار پائے گا قرآن کے ہر حرف کی ادائیگی کو ایک نیکی کہا گیا ہے اور ہر نیکی کا دس گنا اجر ہے قرآن قیامت کے روز سب سے بڑا گواہ ہوگا۔ انسانوں کے مرتبہ و مقام کا تعین قرآن سے تعلق کی بنا پر ہی متعین کیا جائے گا۔

لوگوں کے ساتھ زبان کا استعمال:

لوگوں سے گفتگو میں بنیادی اصول یہ ہے کہ اس سے کسی کو دکھ نہ پہنچے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان مامون ہوں۔''

جو زبان دوسروں کی دل آزاری سے بچالی گئی۔ وہی محفوظ اور کامیاب ہے۔ کسی کا دل دکھانا بڑے گناہوں میں سے ایک ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر:

جہاں کسی انسان کو معروف پر عمل کی ترغیب دینا ہو یا کسی منکر سے روکنا ہو تاکہ وہ آخرت کے عظیم خسارہ سے بچ جائے وہاں زبان کو خاموش رکھنا ایک بڑا جرم ہے، اس فریضہ کو ادا نہ کرنے پر اللہ رب العالمین کی جانب سے گرفت کا اندیشہ ہے حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تم ضرور نیکی کا حکم کرو اور برائی سے روکو۔ ورنہ قریب ہے کہ اللہ تم پر اپنی طرف سے کوئی عذاب بھیج دے۔ پھر تم اس سے دعائیں کرو لیکن وہ قبول نہیں ہوں گی۔'' (صحیح بخاری ۶۱۶۹)

توبہ واستغفار:

انسان بھولتا ہے، غلطیاں بھی کرتا رہتا ہے، اس سے کوتاہیاں بھی سرزد ہوتی ہیں۔ لیکن اسوۂ آدم علیہ السلام یہ ہے کہ اپنی غلطیوں کا اعتراف ہو۔ ان پر اپنے رب سے عفو و درگزر کی درخواست ہو۔ اصلاح کا جذبہ ہو اور آئندہ کے لیے درست طرزِ عمل کا عزم ہو تو رب کریم سے توقع ہے کہ وہ گناہوں کو معاف کر دے گا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اگر کوئی شخص کوئی برا فعل کر گزرے، یا اپنے نفس پر ظلم کر جائے اور اس کے بعد اللہ سے استغفار کرے (یعنی اپنے گناہوں کی معافی مانگے) تو وہ اللہ کو درگزر کرنے والا اور رحیم پائے گا۔'' (النساء ۱۱۱)

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عنایات کی خبر دی، آپؐ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف فرما دیے۔ لیکن پھر بھی آپؐ کثرت سے استغفار فرماتے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

''اللہ کی قسم! میں دن میں ستر سے زیادہ مرتبہ اللہ سے استغفار اور اس کی طرف توبہ کرتا ہوں۔'' (صحیح بخاری، حدیث ۶۳۰۷)

استغفار کے کلمات کی تعلیم احادیث میں دی گئی ہے۔ مثلاً:

☆ اَسْتَغْفِرُاللّٰہَ

☆ اَسْتَغْفِرُاللّٰہَ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ

☆ اَسْتَغْفِرُاللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَیْہِ

☆ اَسْتَغْفِرُاللّٰہَ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَیْہِ

مصیبت زدہ کے لیے ہمدردی کے الفاظ، دل جوئی، مریض کی عیادت، مسافر کو راستہ کی راہنمائی، ایسی نیکیاں ہیں جن کا صدقہ متواتر چلتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔'' (البقرہ ۲۶۳)

جنس مخالف سے گفتگو

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے نسل انسانی کو قائم رکھنے کے لیے مرد کے دل میں عورت سے فطری لگاؤ اور عورت کے دل میں مرد کی طرف جھکاؤ رکھ دیا ہے۔ مرد اور عورت کے ایک دوسرے سے فطری کشش کے علاوہ دونوں کے شیاطین بھی اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ دونوں میں ایسے تعلقات قائم کریں جو فساد اور فتنہ کا سبب بن جائیں۔

اسلام عورت اور مرد کے باہم تعلقات کے بارے میں بہت حساس ہے۔ وہ خاندان کے حصار کو قائم رکھنے اور مستحکم و مضبوط بنانے کے لیے نکاح کے دائرہ سے باہر ان کے باہم تعلق کی کوئی دوسری صورت گوارا نہیں کرتا۔ بلکہ اسے فواحش میں سے بدترین سمجھا گیا ہے۔ ''حیا'' اسلامی معاشرے کی خاص پہچان ہے۔

سلام کو پھیلاؤ:

بھلائی کی دیگر باتوں میں سے اہم سلام کی ترویج ہے اپنے بھائی کے لیے سلامتی کی اس دعا کو کثرت سے پھیلانے کا حکم دیا گیا ہے۔ ''السلام علیکم'' کہنا ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے اور سلام کا جواب دینا فرض عین۔ یہ مختصر کلمات اہل اسلام کے باہم اتفاق و اتحاد اور محبت کی علامت ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''تم جنت میں داخل نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ ایمان لے آؤ اور تم مومن نہیں ہو گے یہاں تک کہ ایک دوسرے سے محبت کرنے لگ جاؤ، کیا میں تمھیں ایسی چیز نہ بتاؤں کہ جب تم اسے اختیار کرو گے تو آپس میں محبت کرنے لگو گے (وہ یہ ہے کہ) تم آپس میں سلام پھیلاؤ اور عام کرو۔'' (صحیح مسلم)

دل سے ہر مسلمان کے لیے خیر خواہی کا جذبہ اور زبان سے سلامتی کی دعا اور یقین دہانی!!

دل جوئی اور ہمدردی:

اسی لیے وہ عورت کے احکامِ پردہ وحجاب میں چہرہ اور آرائش و جمال کو چھپا لینے کے احکام پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کی ''آواز'' کے پردہ کے لیے بھی خاص احکام دیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی پاکیزہ ماؤں کو مخاطب کر کے حکم دیتا ہے۔

''تم لوچدار آواز میں (غیر مردوں سے) بات نہ کرنا کہ وہ شخص جس کے دل میں خرابی ہے (غلط) امیدیں وابستہ نہ کر بیٹھے۔ بلکہ صاف سیدھی اور بھلی بات کرو۔'' (الاحزاب ۳۲)

یہ حکم صرف امت کی ماؤں کے لیے نہیں۔ بلکہ ان پاکباز ماؤں کی وساطت سے تمام اہل ایمان اس کے مخاطب ہیں۔ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

''عورت جب کسی غیر مرد سے بات کرے تو بات میں سختی ہو اور آواز دھیمی ہو کیونکہ عورت کو آواز پست رکھنے کا حکم ہے۔''

حضرت ام عطیہؓ سے روایت ہے:

''میں بھی ان عورتوں میں شامل تھی جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی۔ تو جن باتوں کی آپؐ نے عورتوں سے بیعت لی ان میں یہ بھی تھا کہ ہم نہ تو بین کریں گی اور نہ ہی اس مرد سے باتیں کریں گی جس سے شادی ہو سکتی ہو۔'' (مسند احمد)

جب شریعت کی اس پابندی کا لحاظ رکھا جائے اور عورت غیر مردوں سے گفتگو کرنے سے پرہیز کرے تو مرد کو اس سے کسی قسم کی غلط بات چیت کرنے کی کبھی ہمت نہیں پڑتی۔ غیر مرد کو اگر کسی خاتون سے بات کرنا ہی پڑے تو اس کے لیے واضح ہدایت دی گئی:

''اور جب تم ان خواتین سے کوئی سوال کرو تو پردے (حجاب) کے پیچھے سے مانگو۔ یہ تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔'' (الاحزاب ۵۳)

جب اللہ ذوالجلال امہات المومنین سے پردے کی اوٹ سے بات کرنے کا حکم دیتا ہے جن کے بارے میں خود فرماتا ہے کہ وہ محترم اور پاکباز خواتین ہیں تو پھر دوسری عورتوں کو تو بدرجہ اولیٰ اس پابندی پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ ان احکام کے ہوتے ہوئے کیسے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ تعلیمی اداروں، بازاروں، راستوں، جہازوں، بسوں یا تقریبات میں، گھروں کے اندر یا گھروں سے باہر، خواتین غیر مردوں کے سامنے آئیں یا ان سے بے باکانہ گفتگو ہو، میل جول ہو۔ پردے کی اوٹ سے بھی بات صرف اسی صورت میں جائز ہے، جب کرنا انتہائی ضروری ہو اور دونوں تنہا نہ ہوں۔ پھر بات اتنی ہی کی جائے جو انتہائی ضروری ہو۔ ایسی ہی احتیاط ٹیلی فون پر گفتگو میں لازم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ

روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سوائے اس کے جس سے نکاح حرام ہے کوئی مرد کسی عورت کے پاس تنہائی میں نہ بیٹھے۔'' (بخاری، مسلم)

عورت اور مرد ایک دوسرے کے لیے بڑی آزمائش ہیں۔ معاشرے کو بے حیائی اور خرابی سے بچانے کے لیے اسلام کی بتائی ہوئی احتیاطی تدابیر کے سوا کوئی دوسری تدبیر کارگر نہیں۔ عورت قیمتی ہے، خوشنما ہے اور کمزور بھی۔ اسے نقصان پہنچانے کے لیے کوئی آگے بڑھے تو اس کے لیے اپنا دفاع مشکل ہو جاتا ہے۔ بہترین دفاع بدخصلت انسانوں کی نگاہوں سے روپوشی ہے۔ دوسری جانب مرد طاقتور اور عقلمند ہونے کے باوجود عورت کی رعنائی کے جال میں پھنس کر شیطانی چالوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔

گفتگو کے عیوب

الزامی گفتگو.....جس میں طعن و تشنیع ہو۔ طنز ہو۔ مخاطب کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی جائے، مخاطب کو بولنے کا موقع نہ دیا جائے۔ منہ ہی منہ میں بات کرنا کہ دوسرا سمجھ نہ سکے۔ سخت، کھردرا طرزِ کلام، تیز تیز لہجے میں بات کرنا۔ غیر ضروری طویل بات کرنا۔ مخاطب کی بات سنے بغیر اپنی ہی کہے جانا۔ مبہم اور غیر واضح بات کرنا۔ مجلس میں برابر والے سے کھسر پھسر کرنا۔ تکیہ کلام کا زیادہ استعمال۔ انتہائی عاجزانہ، وقار سے گری ہوئی گفتگو۔ خودستائی یعنی ہر بات میں اپنی ہی تعریف کیے جانا۔ اپنی علمیت کا رعب ڈالنا۔

☆.....☆.....☆

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں ڈاکٹر فضل عظیم کے مرتب کردہ نکات، ڈاکٹر ام کلثوم کی کتاب ''قولوا للناس حسنا''، بنت الاسلام کی کتاب ''زبان کی حفاظت'' اور ''تفہیم القرآن'' سے مدد لی گئی۔

☆☆☆

خاص مضمون

ڈاکٹر گوہر مشتاق
(امریکہ)

نوجوانوں میں سوشل نیٹ ورکنگ کا رجحان

آج سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس پوری دنیا کے نوجوانوں کے دل کی دھڑکن بنی ہوئی ہیں۔ نوجوان اُن کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بعض نوجوان تو شاید ایک یا دو دن تک بھوکا رہنا گوارا کرلیں لیکن فیس بک پر اگر وہ ایک دن نہ جاسکیں تو ہوسکتا ہے کہ اُن کا اعصابی بگاڑ (Nervous Breakdown) ہوجائے۔ بعض نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنے اوپر یہ بات لازم سمجھتے ہیں کہ وہ روزمرہ جو بھی کام کریں اُس کو اپنی فیس بک یا ٹوِیٹر نیٹ ورک پرفائل میں درج ضرور کریں۔ امریکہ کی NBC News کے قانونی نامہ نگار پیٹر ولیمز (Peter Williams) اِس بارے میں لکھتے ہیں:

''اُن (نوجوان لڑکوں لڑکیوں) کی سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس پر پوسٹنگز (postings) جن چیزوں پر مشتمل ہوتی ہیں اُن میں سے کچھ حصہ ذاتی ڈائری ہوتی ہے، کچھ تصاویر کی البم ہوتی ہیں، کچھ غیبت ہوتی ہے (دوسروں کی خامیوں کا ذکر)، اپنے پسندیدہ گانے ہوتے ہیں، کبھی کبھار اپنے فون نمبر اور گھر کے ایڈریس بھی ہوتے ہیں اور بعض اوقات اپنے جسم کو ظاہر کرنے والی تصاویر۔'' [1]

کیلیفورنیا ہائی سکول کی ایک طالبہ اولیویا والکر (Olivia Walker) باقاعدگی سے "MySpace.com" میں سائن اِن کرتی ہے۔ اُس نے پیٹر ولیمز کو انٹرویو میں بتایا:

یہ نوجوانوں کے لئے ایک ذریعہ ہے کہ وہ آپس میں فوری پیغام (Instant Message) بھیج سکیں یا کسی کے متعلق ایسی بات جان سکیں جو اُنھیں پہلے سے معلوم نہ تھی۔ آپ MySpace.com پر نئے تعلقات بنا سکتے ہیں یا آپ نئی دوستیاں (Friendships) پیدا کر سکتے ہیں۔''

اسی طرح امریکی شہر بوسٹن کے نیوٹاؤن نارتھ ہائی سکول کے طالب علم اینڈریو کریڈ نے NBC News کے نامہ نگار کو ایک انٹرویو میں بتایا:

''میرے سکول کے زیادہ تر بچے "My Space" سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹ استعمال کرتے ہیں۔ آپ اِس سائٹ پر اپنی تصاویر پوسٹ کر سکتے ہیں، نئی لڑکیوں سے رابطے قائم کر سکتے ہیں، نئے لڑکوں سے روشناس ہو سکتے ہیں۔''

NBC News کے نامہ نگار پیٹر ولیمز کے مطابق مسئلہ یہ ہے کہ اِن مشہور ویب سائٹس پر بچوں

اورنوجوان لڑکوں لڑکیوں کے علاوہ مجرم ذہنیت والے مرد بھی جاتے ہیں تا کہ کوئی ''شکار'' تلاش کرسکیں۔ مثال کے طور پر حال ہی میں امریکی ریاست کنکٹی کٹ میں 21 سالہ شخص کو گرفتار کیا گیا جس نے MySpace.com سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹ پر 14 سالہ لڑکی سے دوستی کی اور پھر بعد میں اُس لڑکی سے آمنے سامنے ملاقات کے لیے کہا۔ جب اس لڑکی نے اُس شخص سے ملاقات کی تو اُس شخص نے اُس لڑکی کی عصمت دری کر ڈالی ۔ اسی طرح لانگ آئی لینڈ (نیویارک) میں پولیس نے ایک شخص کو گرفتار کیا جس نے ایک سولہ سال کی لڑکی کی تصاویر کسی سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹ پر دیکھیں تو کوشش کر کے کسی طریقے سے اُس لڑکی کا جاب کا ایڈریس ڈھونڈ نکالا۔ ایک دن جب وہ لڑکی اپنی جاب سے چھٹی کر کے پارکنگ گراؤنڈ میں اپنی گاڑی کی طرف گئی تو اُس شخص نے اُس لڑکی سے زیادتی کر ڈالی۔ بعد میں پولیس نے اُس شخص کو گرفتار کرلیا۔ [۲]

اگر یہ حال امریکہ میں ہے جہاں پولیس انصاف پسند ہے تو پھر پاکستان میں کیا حال ہوگا جہاں اکثر اوقات پولیس ، مجرموں کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ پاکستان میں تو سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس سے لڑکیوں کو امریکہ کی لڑکیوں سے بھی زیادہ ہوشیار رہنا چاہیے۔

بہرحال یہ انٹرنیٹ کے جرائم پوری دنیا میں ہورہے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک میں دجالی ایجنٹوں نے داخل ہوکر بنی نوع انسان تک اپنا زہر پہنچادیا ہے ۔ پوری دنیا کے قانون نافذ کرنے والے ادارے اِن جرائم سے تنگ ہیں۔ فلپائن میں بچوں اور بچیوں کا آن لائن جنسی استحصال بہت عام ہے۔ لیونارڈا کلنگ (Leonarda Kling) جو کہ اِس خطے میں بچوں کے استحصال اوراغواء کے خلاف ایک آرگنائزیشن (Terra des Hommes Netherland) کے لیے کام کرتی ہیں، اُن کا بیان ہے:

"In the Philippines, this is the tip of the iceberg. It's not only Facebook and social media, but it's also through text messages ... especially young, vulnerable people are being targeted. It's all about promises. Better jobs or maybe even a nice telephone or whatever. Young people now, you see all the glamour and glitter around you and they want to have the latest BlackBerry, the latest fashion, and it's also a way to get these things."

''فلپائن میں یہ اُس مسئلے کی چھوٹی سی جھلک ہے۔ یہ صرف فیس بک اور سوشل میڈیا ہی نہیں بلکہ ٹیکسٹ میسج

کے ذریعے بھی ہو رہا ہے۔ خاص طور سادہ لوح نوجوان لڑکیاں لڑکے اِس کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ سب وعدوں کے متعلق ہے۔ اچھی نوکری کا وعدہ یا ہوسکتا ہے کہ ایک اچھا سیل فون یا کچھ اور لالچ۔ آج کے نوجوان جب اپنے اردگرد چکاچوند دیکھتے ہیں تو وہ بھی جدید ترین بلیک بیری (سمارٹ فون) یا جدید ترین فیشن حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ اِس طریقے سے (جنسی بھیڑیوں کی جنسی بھوک مٹا کر) حاصل کیے جاسکتے ہیں۔'' [1]

بڑی دلچسپ بات ہے کہ خاتون انسپکٹر لیونارڈا کنگ، مجرموں کی وارداتوں اور مظلوموں کے میڈیا الیکٹرونکس کے حصول کے لئے استحصال کے کیس دیکھ دیکھ کر اِس نتیجے پر پہنچی ہے کہ "It is all about promises" ''یہ سب (جھوٹے) وعدوں کے متعلق ہے۔'' یعنی نوجوان لڑکیاں لڑکے، انٹرنیٹ کے شیطانوں اور مجرموں کے ہاتھوں اپنی عزت، اپنی جان، اپنا سب کچھ صرف اُن کے جھوٹے وعدوں کے پیچھے گنوا بیٹھتے ہیں۔ شیطان کے اسی طریقہ واردات کا ذکر قرآن نے کیا ہے:

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُوراً o

(سورہ النساء: 120)

''شیطان اِن لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انھیں امیدیں دلاتا ہے۔ مگر شیطان کے سارے وعدے سوائے دھوکے کے اور کچھ نہیں ہیں۔''

سوشل نیٹ ورکنگ اور آن لائن چیٹنگ کے خطرات حقیقی ہیں

یہاں پر سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس مثلاً فیس بُک کے استعمال اور آن لائن چیٹنگ کے نتیجے میں ہونے والے صرف دو جرائم کے واقعات (Internet Crime Cases) کو بطورِ مثال اور عبرت کے پیش کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک ہمیں تلقین کرتا ہے کہ ہم واقعات سے سبق سیکھیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ o (سورۃ الاعراف:176)

''تم یہ حکایات و واقعات اُن کو سناتے رہو، شاید کہ وہ اس سے کچھ نصیحت حاصل کریں۔''

فیس بُک کا استعمال کرنے والی برطانیہ کی 17 سالہ لڑکی ایشلی ہال کی کہانی

ایشلی ہال (Ashleigh Hall) برطانیہ کے شہر ڈارلنگٹن کی رہنے والی تھی۔ وہ 17 برس کی کالج جانے والی ایک ذہین طالبہ تھی۔ اپنے فارغ وقت میں ایشلی کا مشغلہ انٹرنیٹ پر فیس بُک کا استعمال تھا۔ فیس بُک پر اُس کی بہت سی سہیلیاں اور دوست تھے۔ زندگی

معمول پر جاتی نظر آرہی تھی کہ اچانک 25 اکتوبر 2009ء کو ایک 33 سالہ شخص (جس سے ایشلی کی انٹرنیٹ پر ملاقات ہوئی تھی) نے ایشلی کی عصمت دری کر کے اُس کو قتل کر دیا۔ ایشلی کے قاتل کا نام پیٹر چیپ مین (Peter Chapmen) تھا جو اب ''فیس بُک کا قاتل'' (Facebook Killer) کے نام سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ اُس کا تعلق بھی برطانیہ سے ہے۔ پیٹر چیپ مین نے اپنے آپ کو فیس بُک پر ایک 19 سالہ نوجوان بتایا تھا اور اپنے فیس بُک اکاؤنٹ پر اُس نے ایک 19 سالہ خوبصورت جوان جس کا سینہ کھلا ہوا تھا کی تصویر اپنی تصویر کے طور پر پوسٹ کی تھی۔ فیس بُک پر ہی ایشلی ہال کی پیٹر چیپ مین سے پہلی آن لائن ملاقات ہوئی اور ایشلی اُس 19 سالہ خوبصورت نوجوان کی تصویر سے بہت متاثر ہوئی۔ 17 سالہ ایشلی کو کیا خبر تھی کہ فیس بُک پر 19 سالہ نوجوان کی تصویر کے پیچھے ایک بھیڑیا موجود ہے جس نے دادی امی کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح لِٹل ریڈ رائڈنگ ہُڈ کی کہانی میں بھیڑیئے نے کیا تھا۔

فیس بُک پر چند روز پیغامات کے تبادلے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے سیل فون نمبر دیئے۔ پیٹر چیپ مین کے خوشامدانہ ٹیکسٹ میسج پڑھ کر ایشلی کی بہت جلد اُس سے دوستی ہوگئی۔ اِس آن لائن رابطے کے ایک مہینے کے اندر اندر پیٹر چیپ مین نے ایشلی کو اِس بات پر آمادہ کر لیا کہ اب دونوں عاشقوں کی رُوبرو ملاقات بھی ہو جانی چاہیے۔ چونکہ پیٹر چیپ مین درحقیقت 33 برس کا تھا، اور فیس بُک پر اُس نے نقلی تصویر دی ہوئی تھی (جو کہ اکثر لڑکے اور لڑکیاں فیس بُک پر کرتے ہیں) اِس لئے ایشلی کو اپنے جال میں پھانسنے کے لئے پیٹر چیپ مین نے اُسے ٹیکسٹ میسج بھیجا کہ پیٹر کا باپ گاڑی پر ایشلی کو پک اَپ کرنے آرہا ہے۔ پیٹر چیپ مین نے ایشلی کو Text کیا:

"My Dad's on his way, babe."

(میرا باپ راستے میں ہے، میری پیاری)

جواب میں ایشلی نے اُسے یہ Text لکھا:

"He's here, babe"

(وہ پہنچ گیا ہے، میرے پیارے)

ایشلی گاڑی میں بیٹھ گئی اور یہ سمجھی کہ گاڑی چلانے والا جس کے منہ میں تمام دانتوں کو کیڑا لگا ہوا ہے وہ پیٹر چیپ مین کا باپ ہے لیکن اُسے علم نہ تھا کہ وہی اصل میں پیٹر چیپ مین ہے جو فیس بُک پر اور Texting میں اُس سے محبت کے دعوے کر رہا تھا۔ گاڑی سنسان علاقے میں لیجا کر پیٹر نے ایشلی پر حملہ کیا، اُس کی عزت لوٹی اور دو روز کے بعد سوموار کے روز ایشلی کی لاش ایک گڑھے میں پائی گئی۔ نیوز رپورٹ کے مطابق:

''ایشلی کی لاش شہر ڈرہم کے ایک کھیت میں ایک

گڑھے میں پائی گئی۔ اُس لڑکی کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور اُس کے منہ پر ٹیپ باندھی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ سانس گھٹنے سے مر گئی تھی۔''

برطانیہ کے عدالتی بیان کے مطابق 25 اکتوبر 2009ء کو پیٹر چیپ مین نے ایشلی سے ملاقات کی، اُس کو اغواء کیا، اُس کی عصمت دری کی اور پھر اُس کو قتل کر دیا۔ ڈرہم پولیس کے سراغ رساں انسپکٹر مِک کالن (Police Inspector Mick Callen) نے اِس دردناک واقعے کے متعلق درج ذیل بیان دیا:

''سچی بات یہ ہے کہ پیٹر چیپ مین ایک جنسی بھیڑیا ہے جو انٹرنیٹ کے پنجوں (tentacles of the internet) کے ذریعے جوان اور سادہ لوح لڑکیوں تک پہنچنا جانتا تھا۔ وہ اِس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اگر وہ اپنا اصلی نام اور تصویر (فیس بُک پر) پوسٹ کریگا تو کوئی جوان عورت اُس کی طرف متوجہ نہ ہوگی۔ لیکن ایک خوبصورت جوان مرد کی تصویر کے بہروپ میں اُس نے دلکشی اور دھوکے کا جال (Web of Attraction and Deceit) بُنا جس کا انجام قتل پر ہوا۔''

اِس بیان میں انسپکٹر مِک کالن نے بہت ہی معنی خیز بات کہی ہے کہ پیٹر چیپ مین نے ''دلکشی اور دھوکے کا جال'' (Web of Attraction and Deceit) بُنا تاکہ وہ اُس میں نوجوان لڑکیوں کو پھانس سکے۔ اصل میں یہی تو انٹرنیٹ کی دجالی صفت ہے جس کی وجہ سے اُسے ورلڈ وائڈ ویب (World Wide Web)(www) کہتے ہیں کہ یہ پوری دنیا پر پھیلا ہوا مکڑی کا ایسا جال ہے کہ جس کی بنیاد ہی دلکشی اور دھوکہ ہے اور اِسی چیز کو عربی زبان میں ''دجل'' کہتے ہیں۔ یہی ''دجل'' دراصل ''دجال'' کے ایجنٹوں کا بنیادی وصف ہے اور اِسی ''دجل'' سے بڑی تعداد میں خواتین اور نوجوان دھوکہ کھا جائیں گے۔

پیٹر چیپ مین کو برطانیہ کی عدالت نے جُرم ثابت ہونے کی وجہ سے 35 سال قید کی سزا سنائی۔ لیکن ایشلی کے گھرانے کو جو نقصان پہنچا اُس کی اب کبھی تلافی نہیں ہوسکتی۔ ایشلی کی ماں اینڈریا (Andrea) اپنے والد کے ساتھ عدالت میں موجود تھی جب جج نے پیٹر چیپ مین کو سزا سنائی۔ اینڈریا کے لیے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی کہ اُس کی شوخ اور چنچل بیٹی کے قاتل کو صرف عمر قید کی سزا سنائی گئی، سزائے موت نہیں دی گئی۔

برطانیہ کے اخبار ڈیلی میل روزنامہ کے کالم نگار فرانسس ہارڈی (Frances Hardy) کو انٹرویو دیتے ہوئے ایشلی کی ماں اینڈریا (Andrea) نے فرانسس کو بتایا کہ اِس واقعے سے پہلے اُس کی بیٹی نے اُس سے کبھی کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ اینڈریا نے بتایا:

''ہمیں ہمیشہ پتہ ہوتا تھا کہ ایشلی کہاں پر ہے۔ وہ

بہت قابلِ اعتبار تھی۔ وہ گھر میں رہنا عام طور پر پسند کرتی تھی۔ ہفتے کے روز ہمارے گھر میں ایشلی کی سہلیوں کا شور شرابا ہوتا تھا جو پیزا (pizza) کھا رہی ہوتی تھیں اور ٹی وی دیکھ رہی ہوتی تھیں۔ یہ اُس کی نیچر کے خلاف تھا کہ وہ مجھ سے جھوٹ بولے۔''

تاہم ایشلی نے اپنی ماں سے جھوٹ بولا اور اُس کے اجازت مانگی کہ وہ اپنی سہیلی کرسٹی (کالج کی سابقہ سہیلی) کے گھر ایک رات گزارنا چاہتی ہے۔ ایشلی کی ماں نے اُسے اِس شرط پر اجازت دیدی کہ اگلے روز وہ صبح ساڑھے دس سے پہلے گھر واپس آجائے لیکن اگلی صبح کو ایشلی واپس نہیں آئی۔ اُس وقت تک پیٹر چیپ مین ایشلی کی عصمت دری کر کے اور اُس کا دم گھونٹ کے اُسے قتل کر چکا تھا اور اُس کی لاش کو ایک گمنام علاقے کے گڑھے میں پھینک چکا تھا۔

آخر کیا وجہ ہے کہ ایشلی نے پیٹر چیپ مین کے بارے میں اپنی ماں سے جھوٹ بولا؟ دراصل پیٹر چیپ مین نے ایشلی کے اوپر وہی حربہ استعمال کیا جو انٹرنیٹ پر کوئی بھی مرد، کسی لڑکی یا عورت کا شکار کرنے کے لیے کرتا ہے اور وہ ہے ''خوشامد کا حربہ''۔ لڑکی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانا اور لڑکی کو یہ احساس دلانا کہ پوری دنیا میں اُس مرد کے لیے وہ لڑکی ہی سب کچھ ہے۔ یہی کام پیٹر چیپ مین نے ایشلی کے ساتھ کیا۔ جب اُس کی ایشلی سے آن لائن ملاقات ہوئی تو اُس نے چاپلوسی، خوشامد اور چکنی چپڑی آن لائن باتوں (Online Sweet Talk) کے ذریعے ایشلی کا دل جیت لیا بلکہ اُسے بیوقوف بنالیا۔ ایشلی کی ماں کے الفاظ تھے:

"Peter Groomed her. He told her she was lovely, funny and pretty."

''پیٹر چیپ مین نے ایشلی کو ذہنی طور پر تیار کیا۔ اُس نے ایشلی کو کہا کہ وہ خوبصورت، دلچسپ اور پیاری ہے۔''

منگل کی رات کو اینڈریا کا باپ (ایشلی کا نانا)، ایشلی کی لاش کی شناخت کرنے کے لیے پولیس والوں کے ساتھ گیا کیونکہ اینڈریا کا صدمے سے بُرا حال تھا اور اُس کی ٹانگوں میں جان نہ تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی زندگی ختم ہوگئی ہے۔ اینڈریا نے بعد میں اُن جاں گسل لمحات کو یاد کرتے ہوئے برطانیہ کے ڈیلی میل کے رپورٹر فرانسس ہارڈی کو بتایا:

''ہر کسی کی زندگی رواں دواں تھی لیکن میری زندگی ساکت و جامد ہوگئی تھی۔ مجھے وہ گڑھا دیکھنے کے لیے جانا پڑا جہاں ایشلی کی لاش کو پیٹر نے پھینکا تھا۔ وہ جگہ خطرناک اور اندھیری تھی۔ میرا جسم اُسے دیکھ کر سکتے میں آگیا۔ میری ٹانگیں حرکت نہیں کرسکتی تھیں۔۔۔بس میں یہ تمنا کرتی ہوں کہ خدا کرے اُس

گڑھے میں پھینکے جانے سے پہلے میری بیٹی مر چکی ہو۔ مجھے اپنے چشمِ تصور میں میری بیٹی چیختی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ اُس اندھیرے والے گڑھے کو دیکھ کر بہت خوفزدہ ہوجاتی۔ گوکہ وہ 17 سال کی ہوچکی تھی لیکن میرے لیے آخر وہ میری بچی ہی تھی۔''

آج بھی ایشلی کی موت کے ڈراؤنے خواب اُس کی ماں کا پیچھا کررہے ہیں۔اکثر اوقات جب ایشلی کی ماں اینڈریا نیند میں جاتی ہے تو اپنی بیٹی کے قتل کے بھیانک خواب اُسے جگا دیتے ہیں۔ایشلی کی ماں کے الفاظ میں:

''جونہی میں سونے کے لیے آنکھیں بند کرتی ہوں تو میں اپنی بیٹی ایشلی کی لاش کو اُس گڑھے میں دیکھتی ہوں۔ میں اُسے اپنی جان بچانے کے لیے چیختے ہوئے اور ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دیکھتی ہوں۔اور میں پیٹر چیپ مین کو بھی دیکھتی ہوں۔''

فیس بُک استعمال کرنے والی ایک انڈونیشین لڑکی کی کہانی، خود اُس کی زبانی

انڈونیشیا کے شہر دیپوک کی 14 سالہ سائرہ (فرضی نام) اپنے سکول کی بہت اچھی طالبہ تھی۔سائرہ فیس بُک استعمال کرنے کی بہت شوقین تھی اور وہ اپنے ہم عمر لوگوں کی دوستی کرنے کی درخواستوں (Facebook Friendship Requests) کو بخوشی (Accept) کا بٹن کلِک کرکے قبول کرلیا کرتی تھی۔سائرہ اپنی تصاویر کو فیس بُک پر لوڈ کیا کرتی تھی اور انھیں اپنے فیس بُک کے دوستوں کے ساتھ "Share" کرنا پسند کرتی تھی۔ وہ اپنی بہت سی آئن لائن سہیلیوں کے ساتھ پرائیویٹ میسیجنگ (PM) سے بھی رابطے میں رہتی تھی اور اِس دجالی نعرے پر یقین رکھتی تھی کہ ''آن لائن رابطہ ہی زندگی ہے۔'' اکتوبر 29، 2012ء کو دیپوک کی رہنے والی سائرہ نے ایسوسی ایٹڈ پریس نیوز (AP News) کے نامہ نگاروں کو اپنے حالیہ اغوا اور مسلسل کئی روز تک عزت لٹنے کے متعلق بتایا جو اُس کے ساتھ ایک ایسے لڑکے نے کیا تھا جس سے سائرہ کی فیس بُک پر ملاقات ہوئی تھی۔انٹرویو دیتے ہوئے سائرہ نے نیوز رپورٹرز کو بتایا کہ اُسے ایک اجنبی نوجوان نے فیس بُک پر دوستی کرنے کی درخواست بھیجی جسے سائرہ نے تجسس کی خاطر قبول کرلیا کہ ''میں صرف دیکھنا چاہتی ہوں کہ یہ لڑکا ہے کون''۔ یہ فیس بُک پر ایک کمپیوٹر کے بٹن کا دبانا (Click of a button) تھا جو سائرہ کے لیے ساری عمر کا پچھتاوا بن گیا:

؎ بس اِک قدم اُٹھا تھا غلط راہِ شوق میں
منزل تمام عمر ہمیں ڈھونڈتی رہی

سائرہ جو کہ ہائی سکول کی طالبہ ہے اور بڑی ذہین بھی ہے، وہ بہت جلد اُس شخص کی چکنی چپڑی اور خوشامدانہ باتوں کی وجہ سے اُس کی محبت میں

گرفتار ہوگئی اور پھر گناہ کی دجالی دلدل میں پھنستی چلی گئی۔فیس بُک پر رابطے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو اپنے سیل فون نمبر دیئے جس کے بعداُن کے آپس میں ٹیکسٹ میسج (SMS) کا تبادلہ شروع ہوگیا۔ اُس شخص نے سائرہ سے درخواست کی کہ دونوں کو ایک شاپنگ مال میں ملاقات کرنی چاہیے۔سائرہ نے اپنی ماں سے جھوٹ بولا اور اُسے بتایا کہ وہ اپنی ایک بیمار سہیلی کی تیمارداری کے لیے جارہی ہے۔ سائرہ نے شاپنگ مال میں اُس نوجوان سے ملاقات کی جس نے اپنا نام یوگی(Yogi) بتایا تھا۔ سائرہ نے یوگی کو جیسا فیس بُک کی تصاویر میں دیکھا تھا حقیقت میں بھی24 سالہ یوگی ویسا ہی دلکش اور خوش شکل نظر آتا تھا۔ یوگی نے سائرہ کو شاپنگ مال سے نئے کپڑے خرید کر اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لیے تحفے کے طور پر دیئے۔ دونوں نے ایک ریسٹورانٹ میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور خوب آپس میں محبت کے دعوے کئے۔ سائرہ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ وہ یہ گمان کررہی تھی کہ اُسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی مل گئی ہے۔

17 سالہ سائرہ اور24 سالہ یوگی نے چند دنوں کے بعد پھر ملاقات کا وقت مقرر کیا۔ سائرہ کے دل میں آتشِ محبت اتنی تیز تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو دن میں کئی کئی مرتبہ محبت کے دعووں کے Text Messages بھیجتے اور فیس بُک پر پیغامات کا تبادلہ کرتے۔ چند دنوں کے بعد مقررہ وقت پر سارہ نے یوگی سے ملاقات کی اور وہ یوگی کی گاڑی پر سوار ہوگئی۔ یوگی اُسے ایک گھنٹے کے سفر کے بعد مغربی جاوا کے شہر بوگور(Bogor) میں پکنگ کے بہانے لے گیا اور وہاں جاکر اپنے گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں قید کردیا جہاں 14 سے17 سال کی مزید پانچ لڑکیاں بھی پہلے سے قید تھیں۔سائرہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی تھی کہ یہ شخص جو فیس بُک پر اتنا سماجی (Sociable) نظر آتا تھا، سیل فون کے ٹیکسٹ میسجز میں اتنا محبت کا دم بھرنے والا (Loving) محسوس ہوتا تھا، فون پر گفتگو میں اتنا دوستانہ (Friendly) نظر آتا تھا، اُسی شخص نے مسلسل سات دنوں تک سائرہ کی آبروریزی کی۔

بالآخر ایک ہفتہ تک مسلسل اذیت دینے کے بعد یوگی نے سائرہ کو بتایا کہ وہ اُسے فروخت کرکے باتم (Batam) کے جزیرے میں بھیج دیگا۔ باتم(Batam) کا جزیرہ ایک ایسی جگہ ہے جو طوائفوں کے کلبوں کی وجہ سے مشہور ہے اور یہاں سنگاپور سے مرد حضرات کشتیوں پر سوار ہوکر یہاں پر موجود طوائفوں سے اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے آتے ہیں۔گھر کی کال کوٹھری میں یوگی زبردستی سائرہ کو نیند کی گولیاں دیتا جس کی وجہ سے سائرہ اپنی قید کے دوران زیادہ

وقت نیم بیہوشی کے عالم میں رہی۔خوش قسمتی سے یوگی کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ سائرہ کو باتم کے جزیرے میں بھیجنے کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید سکے۔ پھر اُس کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ سائرہ کے گھر والے نہایت غصے کی حالت میں اپنی بیٹی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔چنانچہ ایک دن یوگی نے سائرہ کو ایک بس سٹاپ کے قریب پھینکا اور وہاں سے خود فرار ہوگیا۔ اُس بس سٹاپ سے سائرہ اپنے گھر والوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔

دبلی، پتلی، دراز قد اور کاندھوں تک لمبے بالوں والی سائرہ نے AP News کے رپورٹرز کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے چہرے پر ماسک پہنا ہوا تھا تاکہ نیوز رپورٹروں سے اُس کی شناخت پوشیدہ رہے۔ سائرہ نے نیوز رپورٹروں کو بتایا:

''اُس شخص نے مجھے نئے کپڑے خرید کر دیے اور میرے سکول کے اخراجات دینے کا مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ وہ پہلے بہت مختلف تھا..... میرے فیس بک کے ذریعے بہت سے رابطے (Contacts) ہیں اور میں نے لوگوں سے اپنے فون نمبر کا تبادلہ بھی کیا ہے لیکن ہمیشہ سب کچھ صحیح رہا۔ ہم صرف دوست ہوتے ہیں..... مجھے بہت غصہ ہے اور میں اِس کو قبول نہیں کرسکتی جو اُس شخص نے میرے ساتھ کیا ہے..... اُس نے میری آبروریزی کی اور میری پٹائی بھی کی۔''

اصل مسئلہ یہ ہے کہ فیس بک اور اسی طرح کی دوسری سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس پر اپنے رابطے (Contact List) بڑھا کر نوجوان لڑکیاں لڑکے خوش تو بہت ہوتے ہیں لیکن یہ چیز اُن کے انٹرنیٹ پر موجود مجرموں کے ہتھے چڑھنے کے امکانات کو بھی بڑھا دیتی ہے۔ کمپیوٹر ایجوکیشن کی ماہر لوری گائینر (Loir Getz) اِس بارے میں رقمطراز ہیں:

ہمارے بچے انٹرنیٹ پر مشہور (Famo) ہونے کے تصور سے مسحور ہوجاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ انٹرنیٹ پر ہمارے جتنے دوست احباب ہونگے ہم اتنے ہی مشہور ہوں گے لیکن بات ایسی نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جتنے آن لائن رابطے ہونگے، ہم اتنے ہی خطرے کا نشانہ بنیں گے۔''

یوگی نامی شخص جس نے سائرہ کو اغوا کیا تھا پولیس ابھی تک اُس کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوئی اور باقی پانچ لڑکیاں جو اُس کی قید میں تھیں نہ جانے اُن کا اُس شخص نے کیا حال کیا ہے۔انڈونیشیا کے شہر دیپوک کی رہنے والی سائرہ نے اپنے تکلیف دہ ماضی کو یاد کرتے ہوئے بتایا:

''میں نے دیکھا تھا کہ مجھے اغوا کرنے والے شخص نے میرے ساتھ قید بقیہ پانچ لڑکیوں کو میری آنکھوں کے سامنے کئی مردوں کے آگے ''پیش'' کیا تھا۔ مجھے نہیں پتہ اُن لڑکیوں کا کیا بنا۔ میں اب اُس کو یاد نہیں

کرنا چاہتی۔''

انٹرنیٹ گپ شپ (Internet Chatting) ایک ایسا کام ہے کہ شراب کی طرح جس کے فائدے کم اورنقصانات بہت زیادہ ہیں۔ آج ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے انٹرنیٹ چیٹنگ کی بہت سی اقسام معرضِ وجود میں آگئی ہیں۔ مثلاً لفظی گپ شپ (Text Chat) میں سکرین پر الفاظ دکھائے جاتے ہیں۔ صوتی گپ شپ (Audio Chat) میں آوازوں اورنمونوں (Icons) کے ذریعے گفتگو ہوتی ہے۔ ٹیکسٹ مڈز اورموز (Text Muds and Moos) میں کمپیوٹر سکرین میں خیالی ماحول (Fantasy Environment) میں آپس میں رابطے ہوتے ہیں۔اسی طرح کا حال باتصویر سوشل ماحول (Pictorial Social Environments) وغیرہ کا ہے۔

اب انٹرنیٹ کی خیالی دنیا میں سوشل نیٹ ورکنگ پیچیدہ سے پیچیدہ تر اور ہر قسم کی اخلاقیات سے آزاد ہوتی جارہی ہے۔ مثلاً نئے سوشل نیٹ ورک سسٹم (Virtual Social Environments) میں اِس بات کی صلاحیت موجود ہے کہ اُن میں ایک ہزار سے زیادہ صارفین (Users) آپس میں ایک ہی وقت میں رابطہ قائم کرسکیں۔ وہاں پر انٹرنیٹ استعمال کرنے والے نوجوان، اخلاقی لحاظ سے گری ہوئی حرکات کے مظاہرے بھی کرتے ہیں، مثلاً خیالی ماحول میں غنڈہ گردی (Virtual Street Gangsters)، لڑائیاں، گالم گلوچ اور جنسِ مخالف کے ساتھ شرمناک حرکات وغیرہ اور یہ سب کچھ تین جہتی (Three-dimensional) ماحول میں ہوتا ہے جہاں زیادہ سے زیادہ انسانی جسم کی نمائش کی جاتی ہے۔

آیئے اب ہم انٹرنیٹ پر چیٹنگ کے معاملے میں اسلامی نقطہ نظر دیکھتے ہیں بالخصوص یہ سوال کہ کیا لڑکیاں اورلڑکے، عورتیں اور مرد آپس میں کسی بھی قسم کی آن لائن چیٹنگ کرسکتے ہیں؟ سعودی عرب کے عالم دین شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن ابن جبرینؒ (وفات 13 جولائی 2009ء) سے ایک مرتبہ یہ سوال کیا گیا کہ کیا نامحرم جوان مرد اورعورتیں آپس میں اُس صورت میں آن لائن چیٹنگ کرسکتے ہیں جبکہ اُن کی آپس کی آن لائن گپ شپ (Chatting) ہر قسم کی غیر اخلاقی گفتگو، گناہ اورمحبت سے پاک ہو؟

اُس سوال کے جواب میں شیخ ابن جبرینؒ نے درج ذیل فتویٰ دیا تھا:

''اسلام میں کسی بھی مرد کے لیے یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی بھی نامحرم عورت سے آن لائن چیٹنگ کرے کیونکہ اِس میں فتنہ پوشیدہ ہے۔انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ اِس میں کوئی فتنہ نہیں لیکن شیطان مسلسل کوشش کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اُس شخص کو اپنے جال میں پھنسا دیتا ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں

کوحکم دیا ہے کہ اگر وہ دجال کے متعلق سنیں تو اُس سے دور بھاگیں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: ''تم میں سے جوکوئی دجال کے آنے کی خبر سنے تو اُس سے دور بھاگ جائے۔اللہ کی قسم! انسان دجال کے پاس جائے گا اور وہ انسان خود کو مومن سمجھے گا مگر (دجال کی مسلسل کوششوں اور فتنے کی وجہ سے) وہ اُس دجال کی پیروی کر بیٹھے گا۔(ابوداؤد۔طبرانی)

نامحرم جوان مردوں اور عورتوں کے درمیان خط وکتابت (آن لائن چیٹنگ وغیرہ) میں بہت سے فتنے اور خطرات چھپے ہوئے ہیں، اِس لیے ہمیں اِس سے بچ کر رہنا چاہیے، چاہے سوال کرنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ مرد اور عورت کی چیٹنگ ہر قسم کی غیر شرعی باتوں اور محبت سے پاک ہے۔'' [1]

اسی طرح نجد کے معروف عالم شیخ صالح **المنجد** سے ایک مسلمان بہن نے یہ سوال پوچھا کہ وہ انٹرنیٹ کا استعمال کرتی ہیں اور ''اسلامی گپ شپ والے آن لائن کمروں'' (Islamic Chat Rooms) میں بھی جاتی ہیں، کبھی کبھار اُن کی کسی مسلمان مرد سے چیٹ روم میں ملاقات ہوجاتی ہے جو اُن بہن سے یہ درخواست کرتا ہے کہ وہ بہن اُس شخص سے اکیلے میں آن لائن گفتگو (Private Written Chat) کریں تاکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے متعلق کچھ جان سکیں۔ ایسے'' مسلمان بھائی'' کبھی اُس خاتون سے اُسی چیٹ روم میں ہی چیٹنگ شروع کر دیتے ہیں اور کبھی اُس خاتون سے اُس کے متعلق ذاتی سوالات بھی پوچھتے ہیں (مثلاً اُس مسلمان بہن کی عمر کتنی ہے، پسند ناپسند کیا ہیں، اُس کے ذاتی مشاغل وغیرہ)۔ اُس مسلمان بہن نے شیخ صالح **المنجد** سے اِس بارے میں فتویٰ مانگا کہ کیا یہ بات بھی گناہ ہے کہ میں کسی نامحرم مسلمان ''بھائی'' سے صرف لکھائی کی صورت میں گفتگو (Internet Chatting) کر رہی ہوں؟

شیخ صالح **المنجد** نے اُس بہن کے سوال کے جواب میں درج ذیل فتویٰ دیا:

''ایک مسلمان عورت کے انٹرنیٹ استعمال کرنے میں کوئی برائی نہیں اگر اُس کے استعمال کرنے کے نتیجے میں وہ مسلمان خاتون کسی حرام کام کا ارتکاب نہیں کرتی مثلاً نامحرم مردوں سے تنہائی میں آن لائن گفتگو۔ یہ اِس وجہ سے ہے کہ نامحرم مردوں سے آن لائن چیٹنگ کرنے کے نتیجے میں عورت گناہ اور فتنے کا شکار ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اللہ کی رضا کی خاطر اور اُس کے عذاب کے ڈر کی خاطر عورت کے لیے لازمی ہے کہ وہ ایسی باتوں سے اجتناب کرے۔

کتنی ہی دفعہ اس طرح کی نامحرم مردوں اور عورتوں میں گفتگوؤں (Chattings) کے برے نتائج نکلے ہیں اور کئی دفعہ وہ آپس میں محبت میں گرفتار ہوگئے اور کبھی تو اُس سے بھی زیادہ بری حرکات اُن سے سرزد ہوگئیں۔

شیطان، نامحرم مرد اور عورت میں سے ہر کسی کو دوسرے کی عادات وخصوصیات خوش نما بنا کر دکھاتا ہے جس کے نتیجے میں مرد اور عورت کا ایک دوسرے سے قلبی تعلق قائم ہوجاتا ہے جو ناجائز محبت ہونے کی وجہ سے اُن کی روحانی ترقی اور دنیاوی معاملات دونوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ بے شک چیٹ رومز (Chat-Rooms) کے ذریعے آپس کی خط وکتابت، ڈاک کے ذریعے خط وکتابت سے زیادہ خطرناک ہے گو کہ دونوں ہی بری ہیں۔''

افسوس کی بات یہ ہے کہ سوشل نیٹ ورکنگ اور آن لائن ڈیٹنگ اور چیٹنگ کے معاملے میں غیر مسلموں کی پیروی کرتے ہوئے مسلمان بھی وہی کام کر رہے ہیں جو عیسائی، یہودی اور ہندو اقوام کے نوجوان کر رہے ہیں۔ چنانچہ پوری دنیا میں نوجوانوں کے الیکٹرانکس، میڈیا اور سوشل نیٹ ورکنگ کے جنون کے کڑوے نتائج آج غیر مسلم اور مسلم ممالک میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ ایک ایجنسی جو سوشل میڈیا کے استعمال پر نظر رکھتی ہے اُس کے مطابق 2012ء میں انڈونیشیا میں فیس بک کے صارفین کی تعداد 50 ملین تھی جو امریکہ کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ فی الواقع حال ہی میں سوشل میڈیا کو مانیٹر کرنے والی پیرس کی ایک کمپنی "Semiocast" نے انڈونیشیا کے دارالخلافہ جکارتہ (Jakarta) کو پوری دنیا میں ٹوئٹر (Twitter) کا سب سے زیادہ استعمال کرنے والا شہر قرار دیا ہے۔

انڈونیشیا کے بچوں کی حفاظت کے کمیشن (National Commission for Child Protection) کی رپورٹ کے مطابق 2012ء کے صرف ایک سال میں 129 اغوا کیے جانے والی لڑکیوں اور بچوں میں سے ایک چوتھائی نے اجنبی مردوں یا لڑکوں سے پہلے فیس بک پر ملاقات کی تھی اور پھر وہاں سے ہی تعلقات آگے بڑھے اور معاملہ اُن لڑکیوں کے اغوا پر منتج ہوا۔ اُن میں سے ایک لڑکی کی عصمت دری کر کے اُسے قتل کر دیا گیا اور اُس کی لاش سڑک کے کنارے پائی گئی۔☆

انڈونیشیا کے بچوں کی حفاظت کے کمیشن "NCCA" کے چیئر مین آرِسٹ سرائیٹ (Arist Sirait) نے مسلم نوجوانوں کے الیکٹرونک میڈیا کے جنون پر ماتم کرتے ہوئے بیان دیا:

"We are racing against time, and the technology frenzy over Facebook is a trend among teenagers here. Police should move faster, otherwise many more girls will become victims."

''ہمارے ہاں وقت کے ساتھ دوڑ لگی ہوئی ہے اور یہاں کے نوجوانوں میں فیس بک اور اُس کو استعمال

کرنے والی ٹیکنالوجی حاصل کرنے کا جنون کی حد تک شوق پایا جاتا ہے۔ پولیس کو بہت تیز رفتاری کے ساتھ مجرموں کو پکڑنا ہوگا ورنہ مزید بہت سی لڑکیاں اغوا ہو جائیں گی۔''

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلم نوجوان بھی ہو بہو غیر مسلم نوجوانوں کے نقش قدم پر ہی چل رہے ہیں اور ہر اُس سوراخ میں اپنا سر ڈال رہے ہیں جس میں غیر مسلم نوجوان اپنا سر داخل کرتے ہیں۔ آج ہم اپنی آنکھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو سچ ہوتا دیکھ رہے ہیں جسے حضرت ابوسعید خدریؓ نے روایت کیا ہے۔ اُس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

''یقیناً تم لوگ بھی اپنے سے پہلی قوموں کے لوگوں کی پیروی کرتے ہوئے ہُو بہُو وہی کام کرو گے جو اُن پہلے لوگوں نے کئے تھے۔ حتیٰ کہ اگر وہ کسی نیولے کی گوہ یا سوراخ (lizard's hole) میں گھسے ہوں گے تو تم بھی اُس سوراخ میں گھسنے سے دریغ نہ کرو گے۔ تو صحابہ کرامؓ پوچھنے لگے کہ یا رسول اللہ! کیا آپ کی پہلے لوگوں سے مراد یہود اور نصاریٰ ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُن کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے۔'' (صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ؛ صحیح مسلم)

☆☆☆

غزل

مجھے میرے اپنوں نے مارا نہ ہوتا
تو پھر میں کسی سے بھی ہارا نہ ہوتا

تعلق ہمارا تمہارا نہ ہوتا
اگر ضبط کا مجھ میں یارا نہ ہوتا

مرے ساتھ تھا آرزوؤں کا لشکر
اگر دل نہ ہوتا گزارا نہ ہوتا

میں خود اپنی کشتی ڈبونے چلا تھا
جو ساحل سے تم نے پکارا نہ ہوتا

مجھے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی
اگر اُس طرف سے اشارا نہ ہوتا

نہ ہنستے اگر آپ محفل میں مجھ پر
غمِ دل کبھی آشکارا نہ ہوتا

زباں حرف و معنی میں اُلجھی ہی رہتی
اگر شاعری نے سنوارا نہ ہوتا
(کرامت بخاری)

اسماء صدیقہ

درماں

اک درد ہے رستے زخموں کا
اک درد ہے جلتی آہوں کا
اک درد ہے ٹوٹے سپنوں کا
اک درد ہے چلتے تیروں کا
پھر چاروں جانب پھیلا ہے
دہشت کا گہرا سنّاٹا
یہ عالم کتنے برسوں سے
یوں بے کل بے کل رکھتا ہے
ہر گام پہ موت کے پہرے ہیں
یہ شام و سحر کٹ جاتے ہیں
یہ درد والم کے پیمانے
اشکوں سے بھرتے جاتے ہیں
پھر آہ و بکا کے عالم میں
اک شور و فغاں، اک ہنگامہ!
ہم جس میں تنہا رہتے ہیں
بے جان سی اس تنہائی میں
بے دردی کو سب روتے ہیں
پر دُور کہیں کالے کوسوں
اک حرفِ یقیں کے دیوانے
کس بات پہ مٹتے جاتے ہیں
کس نام پہ کچلے جاتے ہیں
بس ان کا ارماں ہوتا ہے
یہ اس کی لگن کو دل میں لیے
ہر طوفاں سے ٹکراتے ہیں
یہ امنِ جہاں کے شیدائی

ہر ظلم کے آڑے آتے ہیں
حیران ہے لیکن عقلِ رسا
کیا آج بھی ایسا ہوتا ہے!
کیا اب بھی وحشت الفت پہ
اس طور چڑھائی کرتی ہے!
کیا جدّت اپنی وسعت میں
ظلمت کی سیاہی بنتی ہے!
پھر ہنستے پھولوں کے موسم میں
کچلے جسموں کا ماتم
یوں مجھ کو لہو رلواتا ہے
یوں تجھ کو لہو رلواتا ہے
اس درد والم کے ریلے میں
اک درد نیا مل جاتا ہے
یہ درد نہاں ہے سب سے جدا
دولت ہے ایسی بیش بہا
امکان کی کوئی صورت ہے
ارمان کی جگ مگ آشا ہے
ہر آنکھ کا سندر سپنا ہے
یہ درد جو رستے زخموں کا
مرہم بھی بنا درماں بھی ہوا
سب جھوٹے خداؤں کے آگے
انکار کا اک فرماں بھی ہوا
ہر گھاؤ جس سے بھر جائے
ایسا ہی کوئی ساماں بھی ہوا

☆☆☆

ام ایمان

باریابی

ایک سے مسافر ہیں
ایک سا مقدر ہے
میں زمین پر تنہا
اور وہ آسمانوں میں

پتہ نہیں شاعر کے لیے ''وہ'' کون تھا عرشیہ کے لیے تو ''چاند'' تھا۔ خوبصورت نازک سا ..... آج چاند کی دوسری تاریخ ہے۔ ذی الحج کا مہینہ شروع ہو گیا۔ بس اب عید میں آٹھ دن ہی باقی ہیں۔ اس نے حساب لگایا۔ امی اور ابا حج کی ادائیگی کے لیے پندرہ دن پہلے روانہ ہوئے تھے۔ شہزاد نے سارا انتظام خاص ایجنٹ کے ذریعے کرایا تھا۔ پیسہ تو خرچ ہوا تھا لیکن شہزاد مطمئن تھا کہ امی ابا کا خیال اچھے طریقے سے رکھا جائے گا۔ عرشیہ نے کہا بھی کہ کچھ پیسہ اور لگا دیں ہم دونوں بھی ساتھ ہی حج کا فرض ادا کر لیتے ہیں، امی ابا کو تنہا بھیجنا ٹھیک نہیں لیکن شہزاد کے دماغ میں جو بات سما جائے اس کا نکالنا آسان نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

عرشیہ کو تنہائی کا شکوہ یوں تھا کہ شادی کو چار سال ہو چکے تھے لیکن گود سونی کی سونی تھی۔ ماں بننے کی تمنا ہر عورت کے لاشعور کا حصہ ہوتی ہے۔ شادی کے بعد شعوری طور پر کی جانے لگتی ہے۔ اس کا احساس آس پاس کا ہر فرد بھی دلاتا رہتا ہے۔ کبھی شعوری طور پر کبھی لاشعوری طور پر..... کہ شادی کو اگر ایک سنگ میل سمجھا جاتا ہے تو اولاد دوسرا جس کو عبور کیے بغیر نامکمل پن کا احساس حاوی سا رہتا ہے۔

اس سلسلے میں عرشیہ خوش نصیب تھی کہ نہ ساس سسر اور نہ ہی شوہر شعوری طور پر اس کمی کا احساس دلاتے تھے ہاں لاشعوری طور پر ہو جائے تو وہ ایک الگ بات ہے۔

امی ابا سے حج پر جانے سے پہلے سارے خاندان سے مل آئے تھے۔ عرشیہ کے میکے سے اس کے والدین خود ہی ملنے آ گئے تھے۔ خوشی کا موقع تھا۔ عرشیہ کی امی نے اپنی سمدھن کو عرشیہ کے لیے خاص طور پر دعا کرنے کی یاددہانی کروائی۔

''بھلا یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔ یہاں بھی میری دعاؤں میں یہ دعا شامل رہتی ہے وہاں تو پھر رب کے در پر چوکھٹ ہی پکڑ لوں گی۔''

مارے جذبات کے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''آنٹی اتنی دعاؤں کو یاد کرنا بھی ایک مشکل کام ہے لوگوں کی دعائیں اُن کے ناموں کے ساتھ.....

یہ ایک نوٹ بک ہے، اس میں میں نے اپنی اور امی ابا کی دعائیں لکھ دی ہیں۔''

عرشیہ کی بڑی بہن فریحہ نے ایک خوبصورت سے مخملیں جزدان میں لپٹی چھوٹی سی نوٹ بک اُن کی طرف بڑھائی۔ عرشیہ کی ساس نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔ ''واہ تم نے تو بڑا یاد دہانی والا کام کیا۔''

اُسی دن بڑی خالہ بھی رات کو ملنے آئیں۔ بہن اور بہنوئی کے حج پر جانے کی انھیں بے انتہا خوشی تھی۔ رشک کے لمحات واقعی ہر ایک کے لیے ہوتے ہیں خاص طور سے اُن لوگوں کے لیے جو ایک دفعہ رب کی بارگاہ اور رب کے محبوب کی بارگاہ میں حاضری لگا چکے ہوتے ہیں۔

طوافِ کعبہ، حجرِ اسود اور دروازے کے چوکھٹ کو پھر تھامنا، حطیم میں نوافل کی ادائیگی، کعبے کے غلاف کو شُرطوں سے نظر بچا کر آنکھوں سے لگانا۔ اُس کے پردوں میں یوں منہ چھپانا جیسے ماں کے آنچل میں منہ چھپا کر ہر غم بھول جاتے ہیں۔ اس کی خوشبو کو سانسوں میں بسانا ..... طواف کے بعد سیڑھیوں اور صحن کعبہ میں بیٹھ کر اُس کے حسین مکھڑے کو تکتے رہنا۔ آہ! کیا کیا کچھ یاد آتا چلا جاتا ہے۔

عرشیہ ملنے کے لیے آنے والوں کے انداز سے ہی بھانپ جاتی کہ یہ حاضری لگا چکے ہیں اور یہ ابھی تمنا کے بار آور ہونے کے متمنی ہیں۔

خالہ جان تو دو حج کر چکی تھیں۔ پھر بھی پیاس جیسے ہر انداز سے محسوس ہو رہی تھی۔ بہن کو گلے لگا کر بلک بلک کر ایسی روئیں کہ ہچکیاں نکل گئیں۔

''ارے ارے آپا کیا ہوا ہے۔ ابھی پچھلے سال تو آپ حج کر کے آئی ہیں۔'' عرشیہ کی ساس نے انھیں تسلی دیتے ہوئے تھام کر کرسی پر بٹھایا۔ ''پھر ان شاءاللہ بلاوا آ جائے گا۔''

انھوں نے اشارے سے عرشیہ کو شربت لانے کو کہا۔ وہ بہن کے سینے سے علیحدہ ہو کر کرسی پر بیٹھیں لیکن جیسے آنسو ابلے چلے آ رہے تھے۔ بار بار آنچل سے صاف کرتیں۔ عرشیہ نے انھیں شربت دیا تو انھوں نے انکار میں سر ہلایا۔ عرشیہ نے ساس کی طرف دیکھا۔ ساس نے سادہ پانی لانے کو کہا۔ شربت رکھ کر وہ پانی لینے چلی گئی۔

بہن کے بہتے آنسوؤں میں چھلکتی تشنگی انھیں اداس کر گئی۔ آپا آپ کا ایسا دل چاہ رہا تھا تو خالد سے کہہ دیتیں وہ ہمارے ساتھ ہی آپ کا بھی انتظام کر دیتا۔ اس کے لیے تو ایسا کچھ مشکل بھی نہیں۔ ماشاءاللہ آپ کی دعائیں اس کو خوب لگی ہیں۔''

''نہیں ریحانہ ایسا نہ کہو.....'' وہ پھر بلک کر رو پڑیں۔

''کیا بات ہے؟'' اب کے عرشیہ کی ساس کو پریشانی سی ہوئی۔ میری دعائیں قبول ہوتیں تو خالد

اس طرح روپے سے روپیہ بنانے کے چکر میں نہ پڑتا۔اس نے نہ جانے کب حدود پار کیں۔حلال اور پاکیزہ رزق میں ملاوٹ ہونے لگی۔کیسی تجارت تھی کہ سارے سرمایے میں گھن لگا بیٹھی۔ یہ تو مجھے معلوم ہی نہ ہوا۔آسائشوں پر آسائشیں ملتی چلی گئیں۔میں سمجھی میری دعائیں قبول ہوئی ہیں، رزق میں برکت ہوئی ہے۔میرا بیٹا جس چیز کو ہاتھ لگاتا ہے سونا بن جاتی ہے۔جب ہی تو اس قدر منافع ہوتا ہے۔اللہ چھپر پھاڑ کر دے رہا ہے۔ یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ برکت نہیں خسارہ ہی خسارہ ہاتھ آیا ہے۔صحت ،اطمینان، خوشیاں، سکون سب جیسے ہم سے روٹھ گئے۔پیسہ کم نہیں ہوا بڑھا ہے لیکن ان چیزوں کو پیسے سے تو نہیں خریدا جا سکتا۔

میرے حج، میرے عمرے، میری عبادتیں، میری دعائیں سب ہی کو باریابی ملنا مشکل ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پڑھی ہے نا!! اس مسافر کے بارے میں جو لمبا سفر طے کر کے کعبہ تک پہنچتا ہے۔لباس، بال خاک آلود ہیں۔سفر کی تھکن سے بے حال ہے۔یارب! یارب! کر کے پکارتا ہے لیکن قبولیت نہیں ملتی، باریابی نہیں ہوتی.....''

ریحانہ خالہ کے آنسوؤں کی لڑی نہ ٹوٹ رہی تھی۔عرشیہ کی ساس دم سادھے سن رہی تھیں۔خود عرشیہ پیچھے کھڑی تھی۔عرشیہ کی ساس آہستگی سے بہن کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر قریب بیٹھ گئیں۔ماتھے پر فکر کی سلوٹیں تھیں۔ چہرہ نمناک سا تھا۔ آنکھیں در و دیوار پر تھیں جہاں کچھ اور منظر چل رہا تھا۔شہزاد خوشی خوشی آ کر مبارک باد دیتا ہے۔

''امی مبارک ہو میری تو لاٹری نکل آئی۔بس یوں سمجھیں منافع پر منافع .....دوہرا اور تہرا منافع ..... آپ کی دعائیں اللہ نے سن لیں دیکھیے گا اس سال میں آپ کو حج پر ضرور بھیجوں گا.....ابا اور آپ بس ابھی سے تیاری پکڑ لیں .....اور ہاں وہاں میرے لیے خوب دعائیں کیجیے گا۔اس دفعہ تو قربانی بھی تگڑے بیل کی کریں گے۔''

ریحانہ خالہ کی ہچکیوں سے وہ چونک سی گئیں۔ انھوں نے بہن کو دیکھا اور پھر اُن کی نظریں بہو پر پڑیں .....عرشیہ بھی اُن کی ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید دونوں ایک ہی بات سوچ رہی تھیں۔عرشیہ اٹھ کر آئی۔

''خالہ جان ! آپ تھوڑا آرام کر لیجیے۔ میں آپ کے لیے کھانا لگاتی ہوں۔کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔''

وہ کمرے سے نکل کر باورچی خانے کی طرف آ گئی۔کام کرتے ہوئے بھی ریحانہ خالہ کی باتیں ذہن میں گھوم رہی تھیں۔

دوسرے دن جب حج کی ساری دستاویزات

مکمل کرنے کے لیے ایجنٹ کو پیسے دینے تھے تو عرشیہ کی ساس نے بیٹے کے ہاتھ پر اپنی اور بہو کی بچت کے ساتھ زیورات کا ڈبہ بھی رکھ دیا۔ شہزاد نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''بس بیٹا دعائیں قبول کروانی ہیں اور ماں باپ کو حج کرانے کا ثواب سمیٹنا ہے تو آمدنی پر کڑی نظر رکھنی ہے۔ حلال حرام کا خیال رکھنا ہے ورنہ تو سب خسارہ ہی خسارہ ہے ..... ہاتھ خالی دامن خالی .....''

شہزاد نے نظریں جھکا کر ماں کی بات سنی۔ اب تو اس بات کو کئی ہفتے گزر گئے۔ بقرعید قریب آ گئی تھی لیکن گھر میں سناٹا تھا۔ امی ابا کے نہ ہونے سے خالی خالی گھر عرشیہ کو کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ شہزاد نے اپنے اوقات بڑھا دیے تھے۔ جلد منافع کے حصول کے لیے کیے جانے والے سارے کام چھوڑ دیے تھے۔ البتہ دکان پر زیادہ محنت اور وقت دینے لگا تھا۔

عرشیہ نے اپنی اکتاہٹ کھانے پینے سے بیزاری کے لیے ڈاکٹر عالیہ امام کا چکر لگایا تو انھوں نے کچھ ٹیسٹ لکھ دیے۔

عید سے ایک دن پہلے ٹیسٹ کی رپورٹ مل گئی تھی۔ عالیہ نے اُسے پوزیٹو قرار دیا تھا۔ ساتھ ہی بہت سی ہدایات اور مبارکباد بھی دی۔ گھر آ کر سب سے پہلے اس نے شکرانے کے نفل پڑھے۔ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہوئے عرشیہ سوچ رہی تھی مالک حقیقی دعائیں کیسے سنتا ہے۔ ابھی تو امی ابا واپس بھی نہیں آئے اور رب نے خوشخبری سے نواز دیا۔

بھلا شہزاد کو یہ خبر کیسے سنائی جائے؟ عرشیہ دل ہی دل میں مناسب جملے ترتیب دینے لگی۔

☆☆☆

مظلوم کی آہ

جس وقت وہ میرے دفتر میں داخل ہوا کئی کلائنٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی ایک طرف کو آ بیٹھا۔ چہرے پر بدحواسی، خوف اور وحشت کے آثار نمایاں تھے۔ گھبراہٹ اس قدر عیاں تھی کہ بار بار چونک کر ادھر ادھر دیکھتا، اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ سے خاصا متمول معلوم ہوتا تھا۔ وہ جس شخص کے ہمراہ آیا تھا وہ میرا پرانا کلائنٹ تھا، جب وہ اندر داخل ہو رہا تھا تو میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا مگر دیگر لوگوں سے گفتگو میں مصروف رہا پھر روایتی انداز میں اپنے شناسا کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا ''خیر تو ہے؟'' وہ بولا ''آپ پہلے فارغ ہو جائیں پھر ذرا تسلی سے بات کرنی ہے۔'' اس کے لہجے میں تو خاصی بشاشت اور سکون تھا مگر اس کے ہمراہ آنے والا بڑا مضطرب اور بے چین اب تک ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

میں نے دیگر کلائنٹ سے فارغ ہو کر انھیں اپنے قریب بٹھایا اور پوچھا ''جی فرمایئے'' میرے پرانے جاننے والے نے بتانا شروع کیا کہا موصوف مختار احمد خان ہیں تجارت کے پیشے سے وابستہ ہیں، انتہائی شریف النفس، بردبار اور خداترس انسان ہیں بس آپ جانتے ہی ہیں کہ کچھ لوگوں کو خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے تو ایسا ہی ایک بات کا بتنگڑ بنا کر کھڑا کیا گیا ہے جس میں انھیں بھی ملوث کر دیا گیا ہے۔ میں نے اصل معاملے کو جاننے کے لیے پوچھا۔ ''آپ اصل بات بتائیں۔'' جس پر وہ بولا ''رات خان صاحب کھانے کے بعد پان والے کی دکان پر کھڑے تھے، دو افراد کے درمیان جھگڑا ہو رہا تھا انھوں نے صلح صفائی کرانا چاہی مگر ان میں سے ایک نے دوسرے کے پیٹ میں قینچی مار دی اب بلاوجہ ان کے خلاف پرچہ کٹوا دیا ہے پولیس والے بھی موٹی آسامی جان کر رات ہی سے ان کے گھر کئی بار آئے مگر میں نے کسی اور عزیز کے یہاں سلوایا تھا۔ اب پہلا کام تو یہ ہے کہ آپ ان کی ضمانت کرا دیں شریف آدمی ہیں پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو وہ نجانے کیا سے کیا بنا دے۔''

میں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ صحیح واقعات بتائیں۔ اب کی بار میں اس نووارد سے مخاطب تھا جس کا نام میرے شناسا نے مختار احمد خان بتایا تھا۔ وہ کچھ گھبراتے ہوئے بولا: ''بات تو یہی ہے جو بتائی ہے۔'' مگر یہ کہتے ہوئے بھی اس کی زبان خشک

ہوئے جا رہی تھی۔ کئی بار اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری جس سے واضح طور پر یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ معاملہ یوں نہیں جیسے بیان کیا گیا ہے۔ مجھے بھی وکالت کرتے دو عشرے ہو چکے چہرے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بیان سچ ہے یا بناوٹی۔ میں نے بڑے تحمل سے کہا۔ ''خان صاحب آپ بالکل نہ گھبرائیں یہاں ہم تین بیٹھے ہیں سچ سچ واقعہ بتائیں تا کہ اس کے مطابق مقدمے کو تیار کیا جائے اور پھر آپ مطمئن رہیں ضمانت تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور اگر آپ حقیقت حال بتا دیں گے تو مقدمے سے بری کرانا بھی کوئی مشکل نہیں۔'' میرے اس اطمینان دلانے پر وہ ہکلاتے ہوئے انتہائی گھبراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔ ''وکیل صاحب! وہ بلاوجہ مجھ سے الجھ رہا تھا مجھے اس سے کترا جانا چاہیے تھا مگر نجانے کس طرح مجھ پر شیطان سوار ہو گیا اور میں نے پان والے کی دکان سے قینچی اٹھا کر اس کے پیٹ میں گھونپ دی اور پھر خون بہتا دیکھ کر بھاگ نکلا۔ انھوں نے بتایا کہ آپ بڑے پائے کے وکیل ہیں پھانسی کے پھندے تک سے لوگوں کو بچا لاتے ہیں تو اب آپ یوں سمجھیں کہ میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے، تھانے اور جیل کے خوف سے رات بھر نیند نہیں آئی۔ یہ تو حقیقت حال تھی اب آپ بتائیں کیا میں بچ سکتا ہوں؟''

میں نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر چھت میں ٹنگے پنکھے کو گھورا پھر ذرا توقف کے بعد کہا ''آپ وکالت نامے پر دستخط کر دیں اور ضمانت کے لیے کاغذات یا زرِ ضمانت کا انتظام کریں۔'' میں نے اپنی فیس ضمانت کے لیے اور مقدمے سے بری کرانے کے لیے بتا دی جس پر وہ بولا ''آپ فیس اور زرِ ضمانت کی فکر نہ کریں میں آپ کو اس سے زائد دے سکتا ہوں مگر.....''

''آپ بالکل فکر نہ کریں آپ کا بال تک بیکا نہ ہوگا۔''

میں نے ضمانت کے کاغذات تیار کیے اور محض دو گھنٹے بعد ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ میری اس پہلی کوشش پر خان صاحب بہت مطمئن ہوئے۔ اب ان کے چہرے پر سکون نمایاں تھا۔ اگلے دو ہفتوں میں پولیس نے چالان پیش کیا جس کے بعد میں نے باقاعدہ ضمانت حاصل کر کے مقدمے میں پیش ہونا شروع کر دیا۔ میرا موکل فردِ جرم سے انکار کر چکا تھا اس لیے مدعی اور گواہوں کو پیش کیا جانا تھا، مدعی ابھی تک اسپتال میں زیر علاج تھا اس لیے تقریباً ایک ماہ بعد پہلی بار باقاعدہ پیشی ہوئی۔ مدعی نے اپنا پیٹ کھول کر دکھایا اور بولا ''کیسے گواہ اور کہاں کی گواہی اس شخص نے قینچی ماری، سترہ ٹانکے لگے ہیں مارنے والے سے بچانے والا بڑا، یوں آج میں یہاں کھڑا ہوں ورنہ اس نے تو

میرا کام ہی تمام کر دیا تھا۔ میں غریب آدمی ہوں علاج معالجے میں مقروض ہو گیا، جج صاحب مجھے انصاف دیجیے یا تو اسے سزا دیجیے ورنہ اس سے کہیں کہ مجھ سے معافی مانگے اور خرچہ دے کیونکہ میں تو مقدمے بازی نہیں کرسکتا۔''

یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ سرکاری وکیل نے اسے بیٹھنے کو کہا میں نے مقدمے کے لیے وہی موقف اختیار کیا تھا کہ جھگڑا رات کے اندھیرے میں تھا۔ قینچی کسی اور نے ماری ہوگی خان صاحب تو محض بیچ بچاؤ کرا رہے تھے اور اب اس شخص کی نیت ان کی دولت پر خراب ہے وہ انھیں بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔ جس پر مجروح شخص کچھ کہنے کے لیے اٹھا اور بڑی گھگھیائی آواز میں بولا۔

''وکیل صاحب! یہ جھوٹ بولتا ہے خدا دیکھ رہا ہے۔''

جس پر میں نے کہا ''آپ مجھ سے نہیں جج صاحب سے مخاطب ہوں میرا کام تو اپنے موکل کا دفاع کرنا ہے۔''

اس کے بعد اگلی تاریخ مقرر ہوئی۔ جب میں اپنے دفتر میں آیا تو کچھ دیر بعد ہی وہی شخص میرے کمرے میں آ پہنچا ایک بار پھر اس نے قمیص ہٹا کر پیٹ کا وہ حصہ دکھایا جہاں ٹانکوں کے نشان ابھی تک نمایاں تھے بولا: ''وکیل صاحب! میں غریب آدمی ہوں مجھے کیوں جھٹلاتے ہیں، آپ تو انصاف کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔''

میں نے کچھ کاغذات دیکھتے ہوئے بڑی بیزاری سے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہ سب کچھ اپنے وکیل سے کہیں میں نے آخر اس شخص سے پیسے لیے ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ میں اسے سزا سے بچاؤں۔''

وہ بولا: ''مگر انصاف اور انسانیت.....''

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''تم درست کہتے ہو مگر سوچو میں نے اس سے فیس لی ہے اور جہاں تک ہوگا میں اسے سزا سے بچانے کی کوشش کروں گا۔''

وہ بولا: ''تو آپ انصاف نہیں ہونے دیں گے یاد رکھیں! مظلوم کی آہ اپنا رنگ جما کر رہتی ہے آپ ضرور اسے بچائیں مگر کس کس کو کہاں کہاں بچائیں گے آسمان پر اللہ بھی تو ہے جو یقیناً مظلوم اور بے کس کی فریاد سنتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پلٹ گیا۔ میں کچھ دیر اس کے جملوں پر غور کرتا رہا مگر پھر دیگر مصروفیات نے ان جملوں کو ذہن سے محو کر دیا۔

اگلی پیشی پر گواہ پیش ہوئے تو میں نے جرح کرتے ہوئے قینچی کی لمبائی اور قینچی کون سے ہاتھ میں تھی، ملزم کہاں کھڑا تھا اور تم نے کیوں نہیں بچایا اور

پان والے کی قینچی سے پیٹ کی اتنی موٹی کھال کیسے کٹ گئی، روشنی کتنی تھی وغیرہ وغیرہ کے ذریعے گواہوں کے بیانات غیر موثر بنا دیے جس کے بعد مختلف تاریخوں پر گواہ اور جوابی گواہ پیش ہوتے رہے پھر سرکاری وکیل نے بہت کمزور انداز میں دلائل دیے کیونکہ میرا موکل اس کی جیب بھی گرم کر چکا تھا۔ جوابی دلائل میں میں نے اپنے موکل کو الزام سے بری قرار دینے کی استدعا کی۔ مقدمے کا فیصلہ محفوظ کر لیا گیا۔ جب جج عدالت سے اٹھ کر جانے لگا تو میں نے دیکھا کہ وہ شخص قمیص اٹھا کر اسے اپنا پیٹ دکھاتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔

چند روز بعد مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا عدالت نے مختار احمد خان کو باعزت بری کر دیا جس کے بعد وہ میرے دفتر آئے مٹھائی اور پھول پیش کیے، فیس کے علاوہ بھی بڑی رقم مجھے بطور انعام پیش کی۔ فیصلے کے دو دن بعد مجھے اطلاع ملی کہ مختار صاحب کا جوان بیٹا ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔ میں تعزیت کو پہنچا وہ بڑی متورم آنکھوں کے ساتھ بیٹھے تھے آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی، میں نے گلے سے لگا کر تسلی دی تو وہ سسکیاں لیتے ہوئے بولے ''وکیل صاحب! زندگی بھر کی کمائی لٹ گئی۔ میرا تو ایک ہی بیٹا تھا کاش اس کے بجائے مجھے .....'' میں نے بیٹھتے ہوئے صبر کی تلقین کی تو بولے ''جو ہونا تھا وہ ہو چکا مگر اس سب سے زیادہ دکھ اس وقت ہوا جب میں قبرستان سے واپس پلٹ رہا تھا تو وہی شخص اپنی قمیص اٹھائے مجھے اپنا پیٹ دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا'' مجھے دیکھو میں تو جیتے جی مر گیا۔'' بس وکیل صاحب! اس وقت تو میں کچھ نہ کر سکا اب میرا ارادہ ہے کہ اس کے پاس جاؤں معافی مانگوں اور کچھ مالی مدد بھی کروں''۔

جو بات خان صاحب نے بتائی اسے سن کر میں کچھ پریشان سا اپنے دفتر میں آ بیٹھا کچھ دیر بعد وہی جج جنھوں نے دو روز قبل مختار کو بری کیا تھا بڑی پریشانی میں آئے اور بڑے رازدارانہ انداز میں بولے'' مجھے آپ کی خدمات چاہئیں۔'' میں نے کہا ''خیر تو ہے؟'' بولے'' پتہ نہیں کیوں اہلیہ کے دماغ میں سودا سمایا ہے میرے خلاف خلع کا مقدمہ کر دیا ہے، بلاوجہ کے دعوے اور الزامات ہیں اب یہ سمجھیں کہ میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے کیونکہ وہ وہ باتیں دنیا کے سامنے آئیں گی جن کے تصور سے بھی کانپ جاتا ہوں۔ آج ہی مجھے سمن ملا ہے۔'' جسے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے'' اور آپ کو ایک غیر متوقع بات بتاؤں جب میں یہ سمن پڑھ رہا تھا تو وہی شخص قمیص اٹھائے اپنا پیٹ مجھے دکھاتے ہوئے کہنے لگا۔ مظلوم کی فریاد کون سنے گا؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا'' تو وہ شخص آپ کے پاس بھی پہنچ گیا۔'' بولے'' ہاں! اور اس کے بعد سے میں کچھ

زیادہ ہی پریشان ہوں۔''

میں جج صاحب کو ملنے والے سمن کے مطالعے کے بعد جوابی بیان تیار کر رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ فون میرے گھر سے تھا اور مجھے جناح اسپتال پہنچنے کی ہدایت کی جا رہی تھی کہ کچھ دیر قبل ایک جھگڑے کے دوران میرا چھوٹا بھائی زخمی ہو کر وہاں پہنچا تھا۔ میں نے ریسیور رکھتے ہی تمام فائلیں بند کیں اور فوری طور پر جناح اسپتال روانہ ہوا۔ ایمرجنسی وارڈ میں میرے چھوٹے بھائی کے پیٹ پر ٹانکے لگائے جا چکے تھے وہ ایک جھگڑے کے دوران پیٹ میں چھری لگ جانے کی وجہ سے گھائل تھا، خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے نقاہت و کمزوری اس پر غالب تھی خون کا فوری انتظام کرنا تھا میں بلڈ بینک پہنچا تو کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے متوجہ کیا میں پلٹا تو یہ دیکھ کر لرز گیا کہ وہی شخص قمیص اٹھا کر اپنا پیٹ مجھے دکھا رہا تھا بالکل اسی طرح کٹا ہوا پیٹ کچھ دیر پہلے میں نے اپنے بھائی کا دیکھا تھا۔ وہ بولا ''وکیل صاحب! انصاف کی راہ میں رکاوٹ کیوں بنتے ہو؟'' میں یکلخت پتھر کا ہو گیا پھر میں نے ہاتھ جوڑ کر اس سے کہا ''مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو مجھ سے غلطی ہو گئی۔''

چند روز بعد جب میرے بھائی کی طبیعت کچھ سنبھلی تو میں اس شخص کے گھر پہنچا اور وہ تمام رقم جو میں نے مختار احمد خان سے مقدمے کے سلسلے میں لی تھی اس کے سامنے رکھ دی اس موقع پر میری زبان گنگ تھی اور میں خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔

میں وکالت کے پیشے سے تو آج بھی منسلک ہوں مگر مقدمہ لینے سے قبل خوب غور کر لیتا ہوں کہ کسی مظلوم کی آہ نہ لگ جائے۔

☆☆☆

ڈاکٹر شگفتہ نقوی

فرض اور قرض

رشتوں کی نازک ڈور سے بندھی ایک کہانی

''فیصلے تو سارے اوپر ہوتے ہیں ہم نے تو ان کو دیکھنا، برداشت کرنا اور ان کے اثرات کے ساتھ ساتھ اپنے رویے اور مزاج کو تبدیل کرنا ہوتا ہے۔'' خاکوانی نے انور کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''بڑے ابا اگر فیصلے اوپر ہوتے ہیں تو پھر ہم ایک دوسرے کو الزام کیوں دیتے ہیں۔ ملنا اور بولنا چھوڑ دیتے ہیں۔ رشتوں کی ڈور کو کاٹ دیتے ہیں۔'' انور نے لیپ ٹاپ سے نظریں ہٹاتے ہوئے کرسی بڑے ابا کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔

''اس لیے کہ ہم اس سپر پاور کی معرفت نہیں رکھتے، پہچان ہی نہیں ہے کہ اس کا فرمان ہر چیز پر چلتا ہے۔ اسے جانا ہوتا، اس کی کتاب میں غور و فکر کیا ہوتا تو ہمارا رویہ مختلف ہوتا۔''

''میرا خیال ہے بڑے ابا آپ کا بیٹا بلا رہا ہے تو آپ ناروے چلے ہی جائیں ان کا فرض ہے کہ آپ کی خدمت کریں۔ اور آپ کا بھی دل چاہتا ہوگا۔''

''تم اچھی طرح جانتے ہو میں سلمٰی، اس کے بچوں اور تمھیں کیسے چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔'' انھوں نے بڑے پیار سے سمجھایا۔

''ساری زندگی کوئی کسی کے لیے انتظار تو نہیں کر سکتا۔''

''خاندان کا مطلب کیا ہے؟ خوشی ہو یا غم۔ مشکل ہو یا مصیبت ایک دوسرے کا بازو بن جانا، سایہ کرنا، ساتھ دینا تا کہ ہماری آزمائش آسان ہو جائے۔ سلمٰی میری بھانجی ہے یہ بیوہ ہوگئی تو تین بچے لے کر میرے پاس آ گئی۔ میں نے اس کا خیال رکھا۔ بھابی راضی نہ تھی کہ اس کو بچوں سمیت پناہ دے۔ مورکھ ہے نادان ہے اسے معلوم نہیں کہ یہ وقت تو کسی پر بھی آ سکتا ہے کہ گاڑی چلتے چلتے پہیہ اتر جائے اور آپ دوسروں کے محتاج ہو جائیں۔ بس اسے اپنے پاس لے آیا۔ اب وہ بھی سکون میں ہے اور میرے گھر میں بھی رونق ہوگئی ہے۔''

''یہ تو آپ کا احسان اور ظرف ہے ورنہ کون کسی کو پوچھتا ہے۔''

''نہ میرے بچے یہ میرا فرض بلکہ قرض ہے جو مجھے اسی زندگی میں ادا کرنا ہے۔''

انور کچھ حیران ہو کر بولا ''فرض کی تو سمجھ آتی ہے ڈیوٹی، لیکن قرض کیسے ہوگیا۔''

''جن لوگوں نے ہمارا خیال رکھا۔ ہماری مشکل میں ساتھ دیا۔ راستوں میں آسانیاں پیدا کیں جیسے ہم پانچ بھائی تھے۔ ابا جان جہاد میں شہید ہو گئے ..... دادا کے بھائی سر غلام نبی زندہ تھے ان کو برطانیہ حکومت نے سر کا خطاب دیا تھا۔ کافی امیر تھے ان کی اپنی جاگیر تھی۔ وہ ہم سب کو وہاں ساتھ لے گئے۔ ہمیں پڑھایا لکھایا۔ دو بھائی فوج میں چلے گئے۔ سب کا ایسے خیال رکھا جیسے ہم ان کی اپنی اولاد ہیں۔ سب کی شادیاں کیں ہماری ماں کے آگے کام کرنے والی خادمہ ہوتی تھی باہر کے کام کے لیے کئی ملازم تھے۔ ہم رشتے میں ان کے بھائی کے پوتے تھے۔ دور کا رشتہ ہوا نا۔ لیکن ہم ہی نہیں بہت بڑی حویلی تھی اسی طرح جس کو بھی ضرورت یا مجبوری تھی کام نہ ملا یا بیماری نے پکڑ لیا وہ دادا کے پاس آ گیا۔ ان کو اللہ پاک نے دولت کے ساتھ ساتھ ظرف، رواداری، درگزر اور فیصلہ کرنے کی قوت بھی عطا کی تھی۔ اب وہ تو چلے گئے لیکن جب تک ہم زندہ ہیں اُن کے عمل کا سلسلہ جاری رہے گا۔''

''کیا موت کے بعد عمل ختم نہیں ہو جاتا؟ جب بندہ ہی نہ رہا تو عمل کہاں اور کون لکھے گا۔'' انور نے سوال کیا۔

''ہم جب تک زندہ ہیں ان کے احسان کے مقروض ہیں جو نیکی بھلائی یا اچھائی انھوں نے ہمارے ساتھ کی ہم نے اگلی نسلوں تک اسے لے کر جانا ہے۔ وہی دنیا ہے وہی لوگ ہیں ابھی کائنات کا انجام نہیں آیا۔ آزمائش چل رہی ہے۔ لہٰذا عمل بھی جاری ہے۔ اب جو نیکی یا فرض سمجھ کر ہم کریں گے اس کے اجر کا ایک حصہ ان کے اعمالنامے میں جاتا رہے گا''۔

''واہ ..... بڑے ابا یہ تو بڑے راز کی بلکہ پتے کی بات بتائی ہے ہم مر گئے لیکن اکاؤنٹ زندہ ہے۔''

''بالکل جب تم پیسے بنک میں رکھتے ہو تو اس میں ترقی ہوتی رہتی ہے اور یہ اکاؤنٹ تو ڈائریکٹ اپنے خالق کے بنک میں ہے جو نہ بھولتا ہے نہ اس سے بے انصافی کا خیال بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''پھر تو ہمیں ہر وقت اور ہر کسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی بھلائی کرتے رہنا چاہیے۔''

''بالکل ..... درست سمجھے ہو۔ ایک مسکراہٹ، میٹھا بول اور ذرا سی ناگوار بات پر چشم پوشی بھی نیکی ہے۔ اس پر کچھ خرچ نہیں آتا بس ذرا دل کو سمجھانا پڑتا ہے۔ خاموشی اور صبر کی عادت اس کام کو آسان کر دیتی ہے۔ ایسا کرو تم گرمیوں کی چھٹیوں میں ناروے اپنے ابا کے پاس چلے جاؤ۔''

''آپ کو اچھی طرح علم ہے کہ میں اس موضوع سے کتراتا ہوں جب سے امی اور ابا میں علیحدگی ہوئی ہے مجھے دونوں برے لگتے ہیں۔ ناروے جاؤں تو وہاں ابا کی دوسری بیوی کے بچے ابا کے نورِ نظر ہوتے ہیں۔ میرے لیے اُن کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ ذرا سا

میرے کمرے میں آ جائیں تو دونوں ریں ریں کرتے پیچھے پیچھے آ جاتے ہیں۔محترمہ کے مزاج بھی برہم ہو جاتے ہیں۔ میں نے تو آٹھویں کے امتحان کے بعد جو چھٹیاں ہوئی تھیں ان میں جا کر دیکھ لیا تھا اور توبہ کی تھی کہ پھر کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔ سجا سجایا کمرہ، ساتھ باتھ روم، ڈبل بیڈ، ٹی وی اور کمپیوٹر محبت کا نعم البدل تو نہیں ہوتا۔اب یہ نہ کہیے گا کہ امریکہ امی کے پاس چلے جاؤ۔ وہاں ان کے شوہر نامدار ہر وقت ان کے سر پر سوار رہتے ہیں.....اور مجھے تو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتے .....آدھی رات کو امی اٹھ کر ان کے لیے سویاں بنا رہی ہوتی ہیں۔ امی ان کے اتنے لاڈ اٹھاتی ہیں کہ بس کیا بتاؤں۔'' غصے سے انور کا چہرہ سرخ ہو گیا اور بے بسی سے اس کے آنسو نکل آئے۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' خاکوانی نے اٹھ کر اسے گلے لگایا تو وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ انھوں نے اسے رونے دیا۔ نہ جانے کب سے یہ غبار اس کے اندر گھٹن پیدا کر رہا تھا۔

خاکوانی نے تسلی دیتے ہوئے کہا ؎

کھل کر جو برس جائے گھٹا نکھرے گا موسم
ہم دو ہیں تو مل جل کے اٹھا لیں گے سبھی غم
دنیا نے تو اس سے بڑے طوفان دیکھے ہیں

یہ بات الگ، تنہا کبھی آپ کبھی ہم

''واہ بڑے ابا آپ کو موقع پر کیسے شعر یاد رہتے ہیں۔ مجھے تو آپ کے حافظے پر رشک آتا ہے۔''

''بس میرے چاند یہ اس کی عطا ہے ورنہ مسلسل کاوش اور جدوجہد حافظے کو بھی متاثر کرتی ہے۔''

''بس ان چھٹیوں میں آپ مجھے دیوان حالی اور فیض و اقبال کی شاعری پڑھائیں گے۔ میں کہیں نہیں جا رہا۔اور پلیز آپ بھی یہ موضوع نہ چھیڑیں۔''

''بیٹا تمھاری امی تمھیں بہت یاد کرتی ہے۔ روتی ہے تمھارے لیے.....''

''اتنی ہی محبت ہے تو آ کر مل جائیں۔''

''میرے نور نظر عورت کا گھر جب ایک بار ٹوٹ جائے تو وہ ساری زندگی اندیشوں کا شکار رہتی ہے وہ یہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہے۔ اس نے اپنا گھر بچانا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے نہ آئیں میں نے کب بلایا ہے .....'' وہ ناراض ہو گیا۔

اتنے میں اذان کی آواز آئی۔''چلو بیٹے ناصر اور یاسر کو بلاؤ۔ نماز کی تیاری کریں۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔'' تینوں بچے خوش خوش بڑے ابا کے ساتھ نماز پڑھنے چلے گئے واپسی پہ سلمٰی نے کہا۔''کھانا تیار ہے ادھر ہی آ جائیں۔ انور تمھاری امی کا امریکہ سے فون آیا

تھا تم بات کر لینا وہ انتظار کر رہی ہوں گی مگر پہلے کھانا کھا لو۔ مجھے برتن سمیٹنے ہیں ناصر اور یاسر کو ہوم ورک کرانا ہے۔''

انور چپ رہا اس کا دل بوجھل تھا۔ لیکن کمرے میں جا کر اس نے وائبر (viber) سے کال کی یہ کال بالکل مفت تھی۔ عظمیٰ نے فوراً جواب دیا۔ ''ہیلو بیٹے کیا حال ہے۔''

''ٹھیک ہوں امی جی......؟''

''کیا بات ہے تمھاری آواز فریش نہیں ہے کیا آج روئے ہو......؟''

''نہیں کچھ نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔''

''مگر بتاؤ نا کیا بڑے ابا نے ڈانٹا ہے۔ پلیز۔ مجھے بتاؤ ورنہ میں آ رہی ہوں میں تمھیں یہاں لے آؤں گی اور اچھے سے کالج میں داخلہ دلواؤں گی۔''

''مجھے نہیں آنا...... آپ اپنا لاڈ پیار رہنے دیں۔ اپنی زندگی کی فکر کریں، خوش رہیں۔ میری بھی گزر ہی جائے گی۔''

''اچھا بتاؤ...... کیا ہوا ہے؟ سلمیٰ نے کچھ کہا ہے؟ میری جان! مجھے رات بھر نیند نہیں آئے گی تمھیں میری قسم سچ بتاؤ کیا ہوا ہے۔''

''امی اتنا کچھ ہو چکا ہے ابھی اور کیا ہونا باقی ہے۔ میرا باپ کہیں ہے اور ماں کہیں ہے۔ ہزاروں میل کے فاصلے پر...... کیا مجھے یاد نہیں آ سکتے ...... کیا آپ میری خاطر اکٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ اولاد ہونے کے بعد زندگی اپنی تو نہیں رہتی۔ بچوں کے لیے بندہ زندہ رہتا ہے...... سلمیٰ پھوپھو بھی تو بچوں کے لیے جی رہی ہیں...... میرا بھی خیال رکھتی ہیں...... جائیں آپ خوش رہیں اپنی دنیا میں۔ اپنے شومار کہ ہزبینڈ کو پلیز کریں، گھر بچائیں مجھے بھول جائیں اسے اپنی دولت کا بہت غرور ہے نا۔''

''ایسا نہیں ہے بیٹا وہ تمھیں بہت یاد کرتے ہیں۔''

''I hate him...... میں بڑا ہو کر اس سے زیادہ دولت کماؤں گا اور پھر آپ کو اپنے پاس لے آؤں گا۔''

''تمھاری باتوں کا میں کیا جواب دوں کاش تم جان سکتے۔ میں تمھیں کتنا چاہتی ہوں۔''

''امی جی چاہت قربانی مانگتی ہے، صبر مانگتی ہے زبانی دعوے تو ہر کوئی کر سکتا ہے۔''

''اچھا مجھے بتاؤ تم کیا چاہتے ہو ابھی بتاؤ میں اسی وقت ٹکٹ بک کراتی ہوں۔ بھاڑ میں جائے سب کچھ میری سٹڈی بھی، میں پاکستان آ کر اپنے بیٹے کے پاس رہوں گی۔ اب خوش...... خدا حافظ''

عظمیٰ انور سے بات کرنے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی کہ اوپر سے اس کے شوہر وقاص آ گئے۔ کیا ہوا میری بیگم کو...... ارے کچھ بتاؤ تو سہی ...... کیا پاکستان سے فون آیا تھا؟''

''نہیں میں نے کیا تھا۔''

''اف اللہ ! صاحبزادے نے پھر کوئی نئی گل افشانی کی ہوگی۔ اب وہ کیا چاہتا ہے ہمیں سکون سے جینے دے گا یا نہیں۔ اسے کچھ پیسے بھجوادو۔''

''اسے پیسوں کی ضرورت نہیں ماں کی محبت کی ضرورت ہے۔'' وہ دھاڑی۔

''تو مجھے بھی اپنی بیگم کی ضرورت ہے۔'' وہ بڑے دلار سے بولا۔

''میں نے شادی کر کے سخت غلطی کی ہے۔ اب مجھے احساس ہو رہا ہے۔ میں نے اپنے بچے کو کھو دیا ہے۔'' وہ روتی جا رہی تھی اور کف افسوس مل رہی تھی۔

''اب میں تمھیں کیسے تسلی دوں۔ اسے یہاں بلالو ۔تمھاری نظروں کے سامنے ہوگا تو دل کو تسلی رہے گی۔''

''نہیں بس میں پاکستان جا رہی ہوں میری سیٹ بک کرادیں۔''

''بہت اچھا میں ابھی اپنے ایجنٹ کو فون کرتا ہوں۔ پلیز رونا بند کرو میں چائے بنالاؤں؟''

''نہیں پہلے ٹکٹ بک کرائیں میں جلد از جلد جانا چاہتی ہوں۔''

''اچھا اچھا تم پیکنگ شروع کرو سیٹ بھی مل جائے گی۔''

وقاص نے لاؤنج میں جا کر فون ملایا۔ ایجنٹ سرکار خان نے کہا کہ مجھے کچھ وقت دیں میں بتاتا ہوں۔ پھر وہ کچن میں گئے چائے بنائی ساتھ شامی کباب تل کر رکھے پانی کا گلاس رکھا اور ٹرے اٹھا کر لائے۔ ''میری ڈارلنگ عظمیٰ چائے حاضر ہے۔''

''مجھے یہ مسخرہ پن اس وقت زہر لگ رہا ہے۔ یہ ایکٹنگ میرے سامنے نہ کریں۔ اصل زندگی تلخ اور زہرناک ہوتی ہے۔''

''لیکن اسے شیریں بنایا جا سکتا ہے میں تو تمھیں خوش کرنے کے لیے یہ ناٹک کر رہا تھا۔ مگر تم تو کریزی ہو رہی ہو۔ لو چائے پیو۔''

''نہیں..... پینی مجھے اسے ڈسٹ بن میں پھینکیں میں بڑے ابا سے بات کرتی ہوں۔''

''ابھی نہ کرو۔ اس نے ہاتھ سے وائبر لے لیا۔ تھوڑا غصہ کم ہو جائے تو پھر کرنا۔''

''رات زیادہ ہو جائے گی وہ سو جائیں گے۔ بوڑھے بندے ہیں مجھے فون دیں۔'' اس نے چیخ کر کہا۔

''یہ لو..... جو مرضی کرو۔ غصہ آتا ہے تو پھر پاگل ہو جاتی ہو۔''

''تمھاری اولاد ہوتی ..... اس طرح جدا ہو جاتی اور تمھیں ایسے جلی کٹی سناتی تو تمھیں پھر بھی میرے دکھ کا انداز نہ ہو سکتا۔ کیونکہ تم ''ماں'' نہیں ہو۔ ماں کس طرح بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے۔ اسے جنم دیتی ہے اور کن کن مشکل مراحل سے اسے پالتی ہے اور تم مرد اپنے نام کا

ٹھپہ لگا کر اولاد کو ماں سے چھین لیتے ہو۔ ظالم، بے حس، بے مروت، بے انصاف، اولاد پر جتنا حق ماں کا ہے اتنا باپ کا نہیں ہے۔''

''اچھا بولتی رہو..... میں نے تو چاہا تھا کہ تمھاری زندگی میں کوئی بہار آ جائے تمھارے دکھوں کا مداوا کروں۔ اس ظالم شخص نے جو کچھ تمھارے ساتھ کیا اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اس کی بازگشت تمھیں پریشان بے چین اوراپ سیٹ رکھتی ہے۔ وچھڑی کونج کی طرح کرلاتی ہو۔ مجھے دکھ ہوتا ہے کبھی سوچتا ہوں میں نے شادی کر کے غلطی کی ہے تم انور کو کسی طرح رضامند کر کے ساتھ یہاں لے آؤ۔''

''جائیں جائیں مجھے مسکہ نہ لگائیں۔ جب وہ یہاں آیا تھا تو آپ کا رویہ مشفقانہ اور پدرانہ ہوتا تو وہ یہاں رہ جاتا۔ وہ اتنا ہرٹ ہوا کہ چلا گیا۔''

''تم خواہ مخواہ مجھے الزام دے رہی ہو ..... تمھارے نخرے میں ہی اٹھاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے نہ اٹھاؤ مجھے سر پہ اٹھا رکھا ہے نیچے پھینک دو میں نے نہیں رہنا۔ مجھے طلاق دے دو میں ہمیشہ کے لیے تمھاری زندگی سے جا رہی ہوں۔''

وقاص کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو ..... اس وقت غصے میں ہو ایسی بات منہ سے مت نکالو۔ ہم دونوں مل کر اس کا کوئی حل نکال لیں گے۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔''

''نہیں مجھے اکیلے جانا ہے۔''

''تمھاری حالت ٹھیک نہیں ہے اکیلے سفر کرنا مناسب نہیں۔ میں تمھارے ساتھ گھر نہیں جاؤں گا۔ میں سوات اپنے عزیزوں کے پاس رہوں گا۔ جب تم اوکے کرو گی تو آ جاؤں گا۔ اچھا یہ نیند کی گولی کھا لو۔ رات زیادہ ہوگئی ہے سو جاؤ۔''

''زہر لا دیں کہیں سے ..... بڑے ابا کا موبائل بند آ رہا ہے۔ شاید سو گئے ہیں۔''

''اچھا منہ ہاتھ دھولو تھوڑی دیر بعد ٹرائی کر لینا۔''

اتنے میں بڑے ابا کا فون آ گیا۔ ''السلام علیکم بیٹی عظمیٰ کیسی ہو۔''

''وعلیکم السلام بڑے ابا آج کیا ہوا تھا۔ میں نے انور کو فون کیا تو اس نے میری اچھی خاصی بے عزتی کی ہے میں اس وقت سے رو رہی ہوں کیا بات ہوئی ہے؟ میں کل آ رہی ہوں۔''

''اوہو..... تم تو بہت اپ سیٹ ہوگئی ہو کچھ نہیں ہوا۔ وہ ٹین ایج میں ہے۔ آج تمھیں یاد کر کے بہت رو رہا تھا اوپر سے تمھارا فون آ گیا اس نے اپنا غصہ تم پر نکالا ہے۔ بچہ ہے معاف کر دو، درگزر کرو اب ٹھیک ہے کھانا کھا کر سو گیا ہے۔ فکر نہ کرو۔''

''اچھا مجھے جونہی سیٹ ملتی ہے میں آ رہی ہوں۔''

''اس ذرا سی بات پر پریشان ہوگئی ہو زندگی تو قدم قدم پر خراج لیتی ہے۔ جو بھی قدم اٹھاؤ سوچ سمجھ کر

پہلے بھی تم دونوں نے سمجھداری سے کام نہیں لیا۔ضرور آ ؤ جم جم آ ؤ تمھارا اپنا گھر ہے لیکن خوشی اور اطمینان سے آ ؤ۔ بے چینی میں سفر نہ کرو۔ اسے میں بہلا لوں گا۔ہاں تمھارے امتحان ہو رہے تھے رزلٹ آ گیا؟''

''ہاں میں نے وہی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ میں نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا ہے۔ مجھے گولڈ میڈل ملے گا۔اس کی تقریب اگلے ماہ کی انتیس تاریخ کو ہو رہی ہے میں چاہتی تھی آپ اور انور میری اس خوشی میں ضرور شریک ہوں اس لیے فون کیا تھا۔لیکن جواباً وہ مار پڑی کہ ساری خوشی کافور ہوگئی۔''

''مبارک ہو یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔تم نے بہت محنت کی۔ دیکھو جہاں آزمائش آتی ہے ساتھ ہی ساتھ انعامات بھی ملتے رہتے ہیں۔ہم تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہیں لیکن نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے بس یہاں ہم سے غلطی ہو جاتی ہے۔''

''ہاں ابا آپ نے ٹھیک فرمایا بس میں تو غصے میں پاگل ہوگئی تھی وقاص کو بھی بے نقط سناڈالیں۔''

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں سوچتا ہوں کہ ہم دونوں آ سکتے ہیں تو کتنے دنوں کے لیے پھر بتاؤں گا۔''

''مگر میں نے تو سیٹ کے لیے کہہ دیا ہے.....''

''تم آ جاؤ ذرا دل بہل جائے گا پھر ہم تینوں اکٹھے سفر کریں گے۔ اور بین الاقوامی ٹکٹ لیں گے تا کہ ساتھ سارا یورپ بھی گھوم لیں۔اب میری زندگی کی شام ہوگئی۔رات ہونے میں کچھ ہی دیر باقی ہے۔ یہ حسرت بھی پوری ہو جائے۔''

''نہ ابا جی ایسے نہ کہیں اللہ آپ کو میری زندگی بھی لگا دے۔ آپ تو انور کا سب کچھ ہیں۔ وہ آپ کی جدائی برداشت نہ کر پائے گا۔آپ کی زندگی بہت لمبی ہو۔''

''اچھا اب اجازت رات بہت ہوگئی ہے۔تہجد کے لیے بھی اٹھنا ہے۔خدا حافظ''

ابھی خاکوانی بستر تک نہ آنے پائے کہ پھر فون بجا۔یہ ان کے بیٹے طارق کا فون تھا نارویے سے۔

''ہیلو ابا جی کیسے ہیں'' طارق خوشی سے سرشار تھا۔

''السلام علیکم.....میں ٹھیک ہوں تم سناؤ۔''

''انور کہاں ہے اس کو فون دیں۔'

''وہ تو سو گیا ہے بہت تھکا ہوا تھا۔ پڑھائی اور کھیل دونوں ساتھ ساتھ جاری ہیں۔کل بات کر لینا کوئی پیغام ہے تو مجھے دے دو۔''

''میں سوچ رہا تھا کہ ان چھٹیوں میں یہاں بھجوا دیں۔''

''مگر اس کی امی پاکستان آ رہی ہے وہ کیسے آ سکتا ہے۔''

''اچھا.....پھر اسے پیار دیں کل فون کروں گا۔''

خاکوانی بستر پر لیٹے تو نیند آنکھوں سے دور تھی۔نہ چاہتے ہوئے بھی ماضی کا جھروکہ سامنے تھا۔

طارق نے اپنی پسند سے ضد کر کے ماموں کی بیٹی عظمیٰ سے شادی کی۔ کوئی بھی اس رشتے کے حق میں نہیں تھا۔ طارق سنجیدہ، اپنے آپ میں مگن، اپنی لیاقت اور مردانہ وجاہت پر نازاں، تعلیمی کیریئر میں سب سے آگے، دوستوں کے جھرمٹ میں ہوتا تو راجہ اندر ہوتا۔ دوستیوفسکی، شیلے، کیٹس اور شیکسپیئر کو کوٹ کرتا، حوالے دیتا، فیض اور اقبال کے شعر سناتا۔ ساری محفل دم بخود اس کو سنتی رہتی۔ ادھر عظمیٰ شوخ چنچل، سادہ دل، جلد غصے میں آنے والی مگر ہر وقت مسکرانے والی۔ مخلص، خدمت گزار، عبادت گزار، چھوٹی بیٹی تھی لاڈلی تھی۔ بے حد حسین نازک سی گڑیا۔ خاندان کے کئی لڑکوں کی ماؤں کی اس پر نظر تھی۔ مگر طارق عمر میں سب سے بڑا تھا اور عظمیٰ سے گیارہ سال بڑا۔ بڑے ابا نے بہت سمجھایا کہ عمر کا اتنا فرق مزاجوں میں تفاوت.....گزارہ کیسے ہو گا۔ لیکن طارق کی ضد تھی کہ شادی ہوگی تو عظمیٰ سے ورنہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گا۔ ابھی عظمیٰ نے ایف ایس سی کا امتحان دیا تھا کہ منگنی کا غلغلہ برپا ہوا۔ رزلٹ میں عظمیٰ نے پورے بورڈ میں دوسری پوزیشن لی۔ میڈیکل کالج کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن طارق نے کہا کہ مجھے تو گھریلو بیوی چاہیے۔ مجھے جاب کرنے والی عورتیں سخت ناپسند ہیں۔

یوں عظمیٰ کی ذہانت، محنت، لیاقت اور شوخی ڈبے میں بند ہو کر رہ گئی۔ اس کی سفید اوورآل پہن کر سٹیتھ گلے میں ڈال کر وارڈ میں پھرنے کی آرزو گھٹ کر رہ گئی۔ اس نے بچپن سے ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھے تھے لیکن خواب تو خواب ہیں ان کی تعبیر کون جانے۔

شادی ہوئی تو عظمیٰ کو بے حد دل جوئی اور توجہ کی ضرورت تھی۔ لیکن طارق تو خود ہیرو تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عظمیٰ تتلی کی طرح اس کے آگے پیچھے پھرے۔ وہ گھر آئے تو پھر ساری توجہ اس کو ملے۔ چنانچہ یہ کلی کھلنے سے پہلے ہی مرجھانے لگی۔ اس بے چاری نے کوشش بھی کی لیکن کم عمری اور خوابوں کے ریزہ ریزہ ہونے سے دل شکستہ تھی۔ اوپر سے انور کی آمد کی نوید مل گئی۔ ان تمام باتوں نے اسے سنبھلنے کا وقت ہی نہ دیا۔ اسے شادی ایک بوجھ، بندھن، قید اور مشکل لگنے لگی۔

طارق نے اس موقع پر سختی شروع کر دی کہ یہی اصل زندگی ہے۔ تعلیم حاصل کرنا اور جاب کرنا تو سراسر اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

سب سے پہلے اس نے ضد کی کہ عظمیٰ برقعہ پہنا کرے۔ اس نے سعادت مندی سے مان لیا۔ اسے اپنی تعلیم کے ادھورا رہ جانے کا بہت قلق تھا۔ انور کی پیدائش کے بعد اس نے پرائیویٹ بی اے کی تیاری کر کے امتحان دیا یہ بھی خاکوانی کی حمایت اور فیصلے کا نتیجہ تھا۔

پھر خاکوانی کو دو سال کے لیے کانگو کی حکومت نے افریقہ بلا لیا۔ انھوں نے جوانی میں وہاں دس سال

ملازمت کی تھی۔ بس گاڑی کسی نہ کسی طرح چلتی ہی رہتی۔ اب طارق گھر میں بڑا تھا۔ خلیج بڑھتی گئی ابا کے جانے کے بعد روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اور واپسی پر ان کو ایک مرجھائی ہوئی عظمیٰ ملی۔ انور البتہ بہت پیارا بچہ تھا۔ تندرست، توانا اور بے حد حسین ایسا کہ راہ چلتوں کو پیار آ جاتا۔ بے بی شو میں ہر سال انعام لے کر آتا اور عظمیٰ کا انٹرویو ریڈیو پر نشر ہوتا۔ سال کی بہترین ماں سے ملیے۔ تین سال تک یہ اعزاز اسی کے پاس رہا۔ ان کی سوچ کی یہاں تک پرواز ہوئی تھی کہ نیند مہربان ہوگئی۔

تین دن بعد عظمیٰ رات تین بجے کی فلائیٹ سے وطن واپس آ گئی۔ ماں بیٹا ملے۔ روئے جھگڑے، گلے شکوے کیے..... لیکن دو دن بعد مطلع صاف ہو گیا اور دونوں بہت خوش نظر آنے لگے۔

عظمیٰ نے سارے گھر کے فرنیچر کی ترتیب بدلی۔ بیٹے کے کمرے میں نئے پردے لگوائے۔ نیا قالین ڈالا۔ لیپ ٹاپ وہاں سے لے کر آئی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اس کا ناشتہ بناتی۔ شام کو دونوں بیڈمنٹن کھیلتے .....لیکن پھر اچانک وہ کھیل چھوڑ کر ریکٹ پھینک دیتا۔ وہ منتیں کرتی کیا ہوا۔ ''آپ نے پھر امریکہ چلے جانا ہے۔ مجھے آپ لالی پاپ دینے آئی ہیں۔ میں اب بچہ نہیں رہا۔ بڑا ہو گیا ہوں۔ جائیں چلی جائیں۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں میں اکیلا ہی جی مرلوں گا۔'' ان باتوں سے عظمیٰ کا کلیجہ کٹ جاتا۔ جب وہ روتی تو خاکوانی اسے سنبھالتے۔ اسی طرح ایک ماہ گزر گیا۔ وقاص کے فون آتے کب آؤ گی تمھارے میڈل کی تاریخ اب اگلے سال ہوگئی ہے وہ گومگو کا شکار تھی۔ کبھی اسے یوں لگتا اس نے انور کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔

انور کا رویہ کبھی اچھا ہوتا، پھر اچانک بگڑ جاتا اور دو دو دن بات نہ کرتا۔ عظمیٰ خود بیمار پڑ گئی۔ ایک دن گاڑی لے کر نکلا تو رات کے دو بجے واپس آیا یہ بات بہت تشویشناک تھی۔ وہ دیر سے گھر آنے لگا تھا۔

خاکوانی دونوں کو لے کر سائیکالوجسٹ کے پاس گئے۔ اس نے ساری ہسٹری سنی۔ تین دفعہ بلایا، وقت دیا، اور پھر بتایا کہ محبت اور نفرت دونوں برابر پرورش پا رہی ہیں۔ جب ماں کی محبت اس بچے پر غالب آتی ہے تو وہ ٹھیک ہوتا ہے لیکن جدائی کے لمحات میں جو تکلیف اس نے اٹھائی لاشعور میں نفرت بیٹھ گئی ہے جب وہ یاد آتی ہے تو اس کا رویہ ابنارمل ہو جاتا ہے۔

عظمیٰ نے پوچھا ''اس کا حل کیا ہے؟ میں اپنا گھر چھوڑ کر تین ماہ سے یہاں بیٹھی ہوں، میں کیا کروں.....؟ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''ابھی اس بچے سے میں نے تنہائی میں ایک Session کیا ہے۔ اس کو اعتبار نہیں ہے وہ سمجھتا ہے کہ آپ پھر چلی جائیں گی۔ وہ جذباتی طور پر اندر سے ٹوٹ کر بکھر گیا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بے حد محبت کرتا ہے۔ کاش میاں بیوی جدا ہونے سے پہلے اپنے

بچوں کے بارے میں سوچ لیا کریں۔صبر کریں اور سمجھو تہ کرلیں، تاکہ اولاد کی بربادی کا تماشہ دیکھنے سے بچ جائیں۔''

عظمیٰ بولی ''باپ کو تو کوئی تکلیف نہیں ہے اس نے اور بچے پیدا کر لیے ہیں۔ یہ ماں ہے جو ساری عمر اس آگ میں جلے گی شاید اسی لیے ماں ہی قربانی دیتی ہے۔''

ڈاکٹر نے کہا ''اسی لیے تو ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔''

اسی دن شام کو جب گھر واپس آئے تو فون کی گھنٹی بجی۔عظمیٰ نے اٹھایا تو وقاص نے کہا ''میں پاکستان آ گیا ہوں فکر نہ کرو۔ٹیکسی لے کر گھر آ رہا ہوں۔''

عظمیٰ کو خوشی بھی ہوئی لیکن پھر انجانے خوف نے اسے آگھیرا.....کیا اس موڑ پر پھر کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔کیا پھر کسی کو پھر کسی کا امتحان مقصود ہے۔طارق سے الگ ہو کر کیا پایا۔بیٹا کھو دیا۔وقاص کو پالیا۔لیکن دل کا سکون تو چھن گیا اور بیٹے کی زندگی یہ کیسا پیارا، ذہین اور ہینڈسم بچہ تھا۔اب کیسا ہو گیا ہے۔اس نے بڑے ابا کو بتایا، وقاص آ گئے ہیں۔وہ سب کے لئے تحائف لے کر آیا تھا۔عظمیٰ کو تو جلدی میں آنا پڑا تھا، وہ صرف لیپ ٹاپ اٹھا لائی تھی۔جس لمحے سے وہ ڈر رہی تھی، آخر وہ سامنے تھا۔

وقاص نے کہا ''میں نے واپسی کا ٹکٹ اوپن رکھا ہے جب تم کہو گی تو سیٹ کنفرم کرالیں گے، کل انور کا ٹکٹ بھی بنوالوں گا۔میرے پاس دس دن ہیں، اگر کہو تو یورپ کا ٹور لگ سکتا ہے، انور خوش ہو جائے گا۔یا شمالی علاقہ جات گھوم لیتے ہیں۔ناران چلتے ہیں۔جھیل سیف الملوک دیکھیں گے۔کیا سوچ رہی ہو؟''

اس نے اپنا دل مضبوط کیا۔اپنے ارادے کو الفاظ کا جامہ پہنایا اور بولی۔''میں امریکہ نہیں جاؤنگی نہ انور جا رہا ہے۔اس عمر میں اسے وہاں نہیں جانا چاہیے۔اس کے لئے پاکستان بہتر ہے۔ یہاں بھی اچھے ادارے ہیں سب لوگ یہاں سے تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ بھی کرلے گا۔''

''لیکن میرا بزنس امریکہ میں ہے اس کا کیا بنے گا؟''

''وہ آپ کا مسئلہ ہے میرا نہیں۔میرا بیٹا میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہے۔میں اسے بکھرتا نہیں دیکھ سکتی۔''

''ہم دونوں مل کر اس کی دیکھ بھال اچھے طریقے سے کر سکتے ہیں۔اسے باپ کی بھی ضرورت ہے۔ لڑکوں کو ماں کی شفقت کے ساتھ باپ کی سختی بھی چاہیے۔''

''ٹین ایج میں بچوں کا امریکہ جانا.....مطلب جانتے ہیں آپ.....؟ گمراہی، بے راہ روی، عریانی، بغاوت، دین سے دوری، نشہ اور کئی دوسری

خرابیاں..... بڑا ہو کر جائے تو اور بات ہے۔''

''تمہیں امریکہ کی خامیاں نظر آ گئیں جس کے ویزے کے لئے لوگ سالوں انتظار کرتے ہیں تمہیں گرین کارڈ مل گیا ہے اس لیے قدر نہیں ہے۔''

''میرا وطن سلامت ہے، مجھے گرین پاسپورٹ پر فخر ہے گرین کارڈ پر نہیں۔ آپ اس کی سڑکوں، ڈسپلن اور تعلیم سے متاثر ہیں یا لبرٹی کے مجسمے سے.....لیکن امریکہ کے دو چہرے ہیں، ایک جو نظر آتا ہے، دوسرا ظالم، بے انصاف، لالچی، ظالم کے ساتھ رہنا بھی ایک ظلم ہے۔'' بڑے ابا اور انور نے اندر آتے ہوئے اس کی بات سن لی تھی۔

''ہاں وقاص کوئی صورت نکالو، بزنس بھی چلتا رہے یہاں آ جاؤ۔ میں نے سالوں بعد انور کو اتنا خوش دیکھا ہے بڑی دعاؤں کے بعد یہ واپس ملا ہے، میرا فرض ہے کہ میں تمہاری رہنمائی کروں تنکا تنکا جوڑ کر گھر بنتے ہیں، دیکھنا کہیں یہ پھر نہ کھو جائے۔''

وقاص نے اٹھ کر بڑے ابا کے گھٹنے پکڑ لیے ''میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے میرے سر پر ہاتھ رکھ لیں۔ میں بھی آپ کا بیٹا ہوں، میں بھی کھو گیا تھا۔ آج میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے وطن میں سب کچھ ہے۔ جو لوگ امریکہ جانے کے لئے بے چین ہیں وہ دیوانے ہیں۔''

''تم بھی میرے بیٹے ہو کیوں نہیں۔ سامنے والی کوٹھی بند پڑی ہے تمہارے لیے کھلوا دیتا ہوں۔''

تم آہستہ آہستہ اپنا بزنس یہاں شفٹ کر لو۔ اپنے وطن کا ہم پر قرض ہے۔ اپنے لوگوں کی خدمت کرو۔''

چاروں مل کر باجماعت مسکراتے ہوئے رو رہے تھے، منزل نظر آنے کی خوشی میں۔

☆☆☆

گلابی چوزہ

داؤد میاں کو آئے دن نت نئے شوق سے مجبور ہو کر اماں سے فرمائشیں کرنا پڑتی ہیں..... بچپن میں (ان کے) ٹرین بہت پسند تھی..... (یہی واحد شوق ہے جو اب تک برقرار ہے) اور آج بھی ٹرین صرف پسند نہیں جنون ہے۔ جہانیاں جانے کا پروگرام بنے تو پہلی چوائس ''ملت ایکسپریس'' ہوتی ہے۔ ایک دفعہ پسنجر ٹرین سے گوجرہ آ رہے تھے اور پاکستانی عوام کی طرح ٹرین رات گئے بے بس ہو کر کھڑی ہو گئی ..... پانچ منٹ دس منٹ یہاں تک کہ گھنٹہ دو گھنٹے گزر گئے ..... دور رہنے والی ہماری جیسی خواتین کو میکہ جانا بالعموم گرما کی تعطیلات میں ہی یاد آتا ہے۔ سو ہر موسم گرما کے تمام لوازمات، مچھر، حبس وغیرہ موجود تھے۔ ٹرین کے ڈبے میں کھچا کھچ سواریاں بھری ہوئی تھیں اور جس کی وجہ سے سانس لینا محال تھا..... چونکہ ہمارا کمپارٹمنٹ انجن کے ساتھ والا تھا میں نے اپنے ''نصف بہتر'' بلکہ ''بہت بہتر'' سے کہا۔ داؤد کو ذرا ڈرائیور سے ملوا لائیں بہت شوق ہے اسے۔

ڈرائیور انکل سے ..... داؤد میاں نے چونک کر دیکھا اور بے ساختہ اپنے ہاتھوں کو دیکھا..... آیا وہ ٹرین کے ڈرائیور سے ملانے کے قابل ہیں بھی یا نہیں ..... حالت یہ تھی کہ

''کہاں میں اور کہاں یہ مقام اللہ اللہ.....''

خیر آمدم برسر مطلب ٹرین کے سدا بہار شوق کے بیچوں بیچ پارٹ ٹائم شوق بھی چلتے ہیں..... کبھی انگلی بھر کی مچھلیاں خرید کر سارے گھر کو ''مچھلی بازار'' بنایا تو کبھی چوزوں کا شوق پال لیا..... پچھلے ہفتہ اجتماع سے واپس آئی تو پنجرہ لینے کو بے تاب۔ جوتوں کے ڈبوں میں ننھے منے چوزے پھدک رہے تھے..... پنجرہ آیا..... فوراً یار دوستوں سے چوزوں کا ڈائٹ پلان دریافت کیا۔

امی چوزے باجرہ کھاتے ہیں اور چوزے کچے چاول کھاتے ہیں ..... اور چوزے گندھا ہوا آٹا بھی کھاتے ہیں۔

لیجیے جناب فوراً باجرہ کی چار پانچ تھیلیاں خرید لائے۔ کچن کی کیبنٹ سے چاول بھی برآمد ہو گئے اور ہر دو منٹ کے بعد آٹے میں پانی گھول کر ان کے آگے ڈالا جا رہا ہے..... چوں چوں کرتے چوزوں کی جیسے ''وبا'' پھیل گئی ہو۔ اڑوس پڑوس میں چاروں جانب چوزے ہی چوزے تھے..... ہفتہ ایک نہ گزرا تھا کہ امی سے بغیر پوچھے تیز گلابی رنگ میں رنگے دو اور چوزے

خریدلائے .....انھیں دیکھ کر پہلے والے چوزے ہر لحاظ سے ''شیر'' لگنے لگے .....لیکن یہ کیا۔ گلابی چوزوں کو پنجرے میں ڈالنا تھا کہ آف وائٹ بڑے چوزوں نے انھیں نوچنا شروع کر دیا.....اور منٹوں میں چوزہ زخمی ہو کر گر گیا .....اس کی پشت اور ٹانگیں خون سے بھری ہوئی تھیں ..... بچوں نے جلدی سے اسے نکالا ..... پایوڈین، ہلدی لگائی کچھ بہتر ہوا.....داؤد صاحب نے غلطی یہ کی کہ بلی کے ڈر سے وہ چوزہ پھر پنجرے میں ڈال دیا..... بھلا رات گئے اس کا رنگ روپ بڑوں کو کیا تکلیف دے گا؟

صبح ہوئی تو وہ ''خونم خون'' پڑا تھا اور آف وائٹ چاروں چوزوں نے اس کا مار مار کر بھرکس نکال رکھا تھا .....

فی الفور اسے ''چار کے ٹولے'' سے نجات دلائی۔ اس کے لیے الگ سے ٹھکانے کا بندوبست کیا.....اس کی مرہم پٹی کی لیکن وہ تو کھڑا ہونے کے قابل ہی نہ تھا .....اس کا ساتھی دوسرا گلابی ہم عمر چوزہ جو پہلے سہما ہوا تھا اب ایک دم مقابلہ پر اتر آیا۔ جونہی ''سینیارٹی'' کا مارا کوئی چوزہ اس پر حملہ آور ہوتا، یہ چوزہ اپنے قد سے بڑا ہو ہو کر اپنا دفاع کرتا۔ دو چار ''دفاعی ٹیکس'' نے بڑوں کو چپ کرا دیا۔ یوں ان کا مسئلہ حل ہو گیا۔ بیچارہ زخمی چوزہ برے حالوں میں تھا اس کا منہ کھول کر پانی ٹپکایا جاتا۔ ہلدی، تیل، پایوڈین لگائی جاتی۔ ڈسپرین گھول کر پلائی جاتی لیکن چھپلی جانب سے اس کے پر تک نوچ لیے گئے تھے۔

بڑے چھوٹے تمام بچے اداس اداس یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔ سب کے ہونٹوں پر ایک ہی سوال تھا۔

''امی بڑے چوزوں نے ایسے کیوں کیا ہے؟''

میں نے افسردگی سے بتایا ..... انسان ہوں یا چوزے جب بندہ ''بڑا'' بن جاتا ہے تو ''چھوٹے'' اسی سلوک کے مستحق سمجھے جاتے ہیں.....فرعون نے تو بھی بڑا بن کر 'انا ربکم الاعلیٰ' کا نعرہ لگا کر بنی اسرائیل سے یہی سلوک کیا تھا۔ آج کشمیر میں ہندو، فلسطین، غزہ میں یہودی، افغانستان، عراق اور وزیرستان میں امریکہ یہی ''بڑا'' بن کر تو چھوٹوں کو قبول نہیں کر رہا.....

''لیکن دو چوزوں میں سے ایک کو انھوں نے کچھ نہیں کہا.....'' فرزند نے کہا۔

''اس لیے کہ اس نے فوراً اپنا دفاع کیا.....اپنی ہمت سے بڑھ کر ہر دفعہ اس نے مقابلہ کیا۔ تو تم نے دیکھا تاریخ کیا گواہی دیتی ہے..... جب بھی روئے زمین پر کوئی قوم دفاعی قدم اٹھائے یا پھر برابر کا مقابلہ کرے خواہ ایران ہو یا سوڈان .....امریکہ ادھر کا رخ نہیں کرتا..... گھگھیاتا ہے.....خود سوچو میں نے اپنے بچوں کو مخاطب کیا۔ اللہ رب العزت ان مسلمانوں سے کتنا پیار اور فخر کرتا ہوگا جو اس کے دشمنوں کے خلاف اٹھ کر امت مسلمہ کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کرتا ہے، اس کے دشمنوں کو للکارتا ہے، صرف دفاعی قدم نہیں اٹھاتا بلکہ ایڑیوں کے بل کھڑے ہو ہو کر خواہ معوذ معاذ

ہوں یا آج کے کم سن مجاہدین، آنکھیں دکھاتا ہے.....
اللہ ان کو کیا خوشخبری دیتا ہے؟''

''کیا؟'' داؤد بے ساختہ پوچھنے لگا۔

اللہ ان کو موت نہیں دیتا ..... زندہ رکھتا ہے تا قیامت ان کو رزق دیتا ہے..... جنت جانے کے لیے ستر دوزخیوں کی سفارش کرسکتا ہے اور یہ کہ جنت میں داخل ہونے سے پہلے ان کو جنت کے گلی کوچوں سے واقفیت دیتا ہے۔ اور وہ جنت میں یوں پھریں گے جیسے یہیں کے رہنے والے ہوں.....

چوزہ تو سسک سسک کر دس بارہ گھنٹوں کے بعد مر گیا لیکن ہمارے دل میں ایک ہی دعا تھی کہ بارالٰہی امت مسلمہ کو سسکا سسکا کر ختم نہ کرنا۔ اس کی آنکھیں کھول.....اسے اپنی پہچان عطا کر، اپنا مقام حاصل کرنا سکھا، اسے زندہ و بیدار کر دے تا کہ سارے ''بڑے'' اپنی اوقات میں واپس آ جائیں۔

☆☆☆

صبیحہ نبوت خان

امی

''آپ اتنے دن بعد آئی ہیں۔''

یہ کہہ کر میں نے آگے بڑھ کر امی کا استقبال کیا۔ میں نے امی کا ہاتھ تھاما۔ دیکھا تو دو موتی سفید براق ہاتھ پر جگمگا رہے تھے۔ یہ کس کے آنسو تھے؟ اب نظریں سوالیہ نشان تھیں۔ میں نے ان کی طرف دیکھا لیکن وہ اپنی عادت کے مطابق مسکرا رہی تھیں اور کسی خیال میں گم۔

پھر یہ کس کے آنسو تھے؟..... یہ جاننے کے لیے میں نے اپنے رخسار پر ہاتھ رکھا تو وہاں دو کیا بے شمار موتی پھیل رہے تھے۔ لیکن میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی اور امی سے مخاطب رہی۔

''آپ اتنے دن سے کہاں تھیں۔ میں روز انتظار کرتی ہوں اور آپ کو یاد کرتی ہوں'' ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ میں نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہہ رہی تھیں۔

''میں یہیں تو تھی تمھارے پاس! اس دن جب تم پریشان تھیں..... میں نے ہی تو تمھیں پیار کیا تھا۔ کیا تم بھول گئی ہو۔'' وہ رک رک کر بولتی رہیں..... ''تم بیمار ہوتی ہو تو کون تمھاری خدمت کرتا ہے؟ کون تم کو دوا پلاتا ہے؟ کون تمھارا سر دباتا ہے؟ کون تسبیح لے کر ساری ساری رات تمھارے لیے دعائیں کرتا ہے؟ کون تمھاری صحت یابی کے نفل مانتا ہے؟ کون صدقہ خیرات کرتا ہے؟ کون ہے وہ بولو نا'' انھوں نے اتنے بہت سے سوالات کر ڈالے۔

واقعی وہ کون ہے؟ دل ہی دل میں میں نے یہ جملہ دہرایا..... ''کوئی تو ہے جو مجھے مرنے نہیں دیتا..... کیا وہ آپ ہی ہیں..... یقیناً آپ ہی کی دعاؤں سے میں زندہ ہوں..... آپ ہی نے ہمیشہ مجھے حوصلہ دیا ہے اور گرنے سے بچایا، ہر موقع پر تھاما۔''

''پھر تم پریشان کیوں ہو۔ میں یہیں تو رہتی ہوں اور اگر نہ بھی رہوں تو کیا تمھیں بھول سکتی ہوں یا تمھیں چھوڑ سکتی ہوں؟''

وہ بولے جا رہی تھیں اور میں سنے جا رہی تھی۔ آنکھیں جل تھل تھیں، جسم ساکت تھا اور اس وقت صرف ایک ہی خواہش کہ وہ سامنے بیٹھی رہیں، یوں ہی بولتی رہیں اور میں ان کے وجود میں کھو کر ہر شے سے بے خبر انھیں دیکھتی رہوں اور سنتی رہوں کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ سارا طلسم اس گھنٹی کی ٹرن ٹرن میں گھومنے لگا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ آنکھوں کے سیلاب اور دل کی جلن کو چھپا کر مسکرانے کی کوشش کی۔ آواز کو بدلا۔ ریسیور اٹھایا تو بے ربط آوازیں آنے لگیں۔

''کیا کھانا تیار ہے؟ میرے ساتھ کھانے پر کچھ اور لوگ بھی ہوں گے۔'' یہ سنتے ہی میں سٹپٹا گئی واقعی میں نے تو ابھی کچھ بھی نہیں پکایا۔ ''کیا آپ بازار سے کچھ نہیں لا سکتے؟''

''نہیں بھئی بہت سے لوگوں کے ساتھ بازار جانا ممکن نہیں۔تم کچھ سادہ سا کھانا بنالو۔''

انھوں نے یہ کہہ کر فون تو بند کر دیا لیکن میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔اف اللہ اب کیا کروں؟ کیا چیز جلدی پک سکتی ہے؟ گھر میں آلو ہی تھے جو اس وقت جلدی پک سکتے ہیں یہ سوچ کر میں نے آلو انڈے کا سالن، آلو کا بھرتا، آلو کی کھیر اور آلو کے پراٹھے بنا ڈالے۔اس وقت میرا دھیان کھانے میں ہی تھا۔

اچانک ایسا لگا کسی نے آواز دی گھوم کر دیکھا تو امی.....

''ارے آپ یہاں چلی آئیں میرا کام ختم ہو گیا ہے۔''

میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔امی کا وہی شکوہ ''تم کو تو بات بھی کرنے کی فرصت نہیں ملتی ہے۔کام اتنا ہی کرو جس کا بوجھ آسانی سے اٹھا سکو حد سے زیادہ کام نے تمھاری صحت خراب کر دی ہے۔''

''امی یہ سب تو پرانی باتیں ہیں کوئی نئی بات سنائیں۔''

''میرے پاس کون سی نئی بات ہے۔'' انھوں نے سر جھکا کر میرا ہاتھ سہلانا شروع کر دیا۔'' کتنے کمزور ہو گئے ہیں.....رگیں تک ابھر آئی ہیں۔''

اتنے میں کچھ جلنے کی بدبو آئی ''ارے کچھ جل رہا ہے میں ابھی آئی۔'' یہ کہہ کر کچن کی طرف دوڑی آلو کی بھجیا جلتے جلتے بچ گئی۔شکر ہے پیچھے سے آواز آئی ''کیا جلا'' دیکھا تو امی پھر کھڑی تھیں۔

''بچ گیا امی.....''''شکر ہے'' انھوں نے بھی شکر ادا کیا۔''ارے آپ یہاں گرمی میں بار بار کیوں آ جاتی ہیں'' وہ مسکرائیں۔''میرے لیے گرمی ہے تو تمھارے لیے کیا ہے؟'' ان کی بات تو صحیح تھی.....لیکن میں نے انھیں تسلی دینے کے لیے کہا۔'' امی میں تو ہر تکلیف برداشت کر سکتی ہوں۔پھر مجھے تو یہ سب کرنا ہی ہے نا؟ گرمی کیا اور سردی کیا۔''

''کیوں تم انسان نہیں ہو۔'' یہ کہہ کر وہ مڑ گئیں۔ میں بھی پیچھے پیچھے تھی۔'' چلیں اب آپ لیٹ جائیں میں آپ کے لیے فیض احمد فیض کی پسندیدہ غزل لگاتی ہوں۔''''نہیں بھئی مجھے نہیں سننا۔'' امی نے پہلی دفعہ غزل کے بارے میں یہ بات کہی۔'' کیوں امی.....''

''بس تم میرے پاس بیٹھی رہو۔تمھیں تو بات کرنے کی فرصت ہی نہیں۔''

''میں نے سوچا تھا میں صفائی وغیرہ کر لوں گی اتنی دیر میں۔''

''بھئی تمھارے ساتھ تو یہی مسئلے لگے ہوئے

ہیں۔ پھر میرے آنے نہ آنے کا شکوہ کیوں کرتی ہو۔''

''اچھا چلیں میں یہیں بیٹھی ہوں بس میں آپ کو اب جانے نہیں دوں گی آپ کے بغیر بہت سناٹا ہوتا ہے۔ کوئی بات کرنے والا ہی نہیں ۔ کوئی ہمدرد بھی نہیں۔ کوئی نہیں کہتا تم نے اتنا کام کیوں کیا۔ بس آپ یہیں رہیں یا مجھے اپنے پاس بلا لیں۔'' میں نے روتے ہوئے امی سے التجا کی۔ انھوں نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''تم رویا نہ کرو۔ مجھے سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہے ۔تمھارے آنسو میری برداشت سے باہر ہیں اور اگر تم اسی طرح روتی رہیں تو میں آنا چھوڑ دوں گی۔ میں نے تمھیں جو کچھ سبق دیے تھے کیا وہ بھول گئی ہو۔ میں نے تمھیں ہمیشہ صبر کی تلقین کی اور تم کو ویسا ہی پایا۔ تم نے کبھی کسی سے شکوہ نہیں کیا نہ کسی سے حسد نہ کسی سے نفرت نہ کسی کی برائی۔ پھر یہ بار بار کا رونا کیسا۔ شاید یہ تمھارے لیے آزمائش ہے اور ایسے ہی صابر لوگوں کو اللہ تعالیٰ آزماتا ہے۔ یہاں جو صابر ہے وہی اس کی محفل میں سرخرو ہوتا ہے اور کندن بن کر نکلتا ہے۔ اس لیے بجائے رونے کے یہ سوچو کہ ہر کام میں اس کی کوئی نہ کوئی بھلائی ہو گی جو انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہم اس سے شکوہ بھی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ رحیم بھی ہے کریم بھی ہے اور محبت کرنے والا ہے۔ وہ ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ پتہ ہے تمھیں میری محبت کچھ بھی نہیں۔ تو کیا تم اس کی محفل میں سرخرو ہونا نہیں چاہتی ہو؟'' یہ کہہ کر امی نے میرے آنسو پونچھے۔ میں نے ان کی گود میں سر رکھ دیا۔

''مجھے آپ کی ہر بات یاد ہے ..... ہر بات یاد آتی ہے امی ..... میری آنکھوں میں، دل میں، دائیں بائیں، آس پاس پورے گھر میں، پورے ماحول میں، خوابوں میں، حقیقت میں صرف آپ اور آپ کی باتیں ہی ہیں۔''

''بس تو پھر **ان اللہ مع الصابرین** یعنی اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اسی کو یاد رکھو وہ تمھارے ساتھ ہر ہر قدم پر ہے۔ یہ سب آزمائش ہے میری بیٹی۔''

ابھی امی نے اپنی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ امی نے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ ''جاؤ دروازہ کھولو اور مہمانوں کو دیکھو۔'' میں نے اپنے آنچل سے آنسو پونچھے۔ امی کے پاس سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اٹھنا تو تھا۔ دروازہ کھولا میز لگائی اور کھانا لگایا۔ مزے لے لے کر سب نے کھانا کھایا۔ میں ٹرے لگا کر امی کے لیے کھانا لے کر کمرے میں آئی تو کمرہ خالی تھا۔ میں ٹھٹھک گئی۔ ''ارے امی .....'' وہ کہیں بھی نہیں تھیں لیکن ان کی خوشبو سے پورا کمرہ معطر تھا اور ہر کونے سے ایک ہی آواز آ رہی تھی۔

''بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

☆☆☆

شاہدہ ناز قاضی

جھیل اور پرندہ

''بے وقوف عورت! میری ہرے رنگ کی ٹائی تم نے کیوں نہیں رکھی ..... اور اور یہ بیگ میں یہ سب کچھ کیا ٹھونس لیا ہے۔ہم جہاز میں جا رہے ہیں .....کوئی گدھا گاڑی میں نہیں ..... اب جلدی جلدی ضروری سامان چھانٹو! جو کپڑے میں اوکے کروں صرف وہی ڈالنا۔اپنے لیے جو چاہو رکھو.....لیکن دیکھنا سوئٹزرلینڈ میں ہمیں اپنے بزنس مین دوست کے گھر ٹھہرنا ہے.....تمھارے کپڑے اچھے اور معقول ہونے چاہئیں۔چلو جلدی کرو.....میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو.....اپنا کام ختم کرو..... جہاز کے جانے میں صرف چھ گھنٹے رہ گئے ہیں۔''

وہ اپنی لمبی تقریر جھاڑ کر وارڈ روب کی طرف بڑھ گیا تھا اور وہ عورت اپنی انگلی میں پھنسی ہیرے کی انگوٹھی دیکھتی رہ گئی تھی جس کا نگ اس کے شوہر کی بے رحم نگاہوں سے ملتا جلتا تھا۔شوہر کے آخری فقرے نے اسے جھٹکا سا دیا اور وہ اپنے لرزتے ہوئے وجود کو سمیٹتی ہوئی دوبارہ بیگ کی پیکنگ میں جت گئی۔

یہ بات درست نہ تھی کہ اسے کسی کام کا سلیقہ نہیں تھا درحقیقت بات صرف یہ تھی کہ اُسے دولت مند خاوند کی بیوی بننے کا سلیقہ نہیں تھا.....غربت سے امارت کا یہ سفر گزشتہ پانچ برس میں ہی تو طے ہوا تھا.....اس سے پہلے تو وہ کلرک کی بیوی تھی کلرک صفدر شاہ.....زینب بی بی کا شوہر اور چار بچوں کا باپ.....اس کے چھوٹے سے گھر میں ہزاروں نا تمام خواہشوں کے انبار لگے رہتے تھے۔بچوں کی بڑھتی ہوئی فیسوں کی یلغار.....بڑی بیٹی کی شادی کی فکر۔اُن کے سر پہ سوار رہتی تھی کبھی کوئی بھوکا ہوتا، کبھی کوئی بیمار مگر پھر اچانک خدا کو ان پر ترس آ گیا۔افریقہ میں اُن کے دور پار کے ماموں رہتے تھے۔انھوں نے اچانک ویزہ بھیج دیا تھا وہاں سونے کی کانوں کا ذکر وہ سنتی آئی تھی.....مگر اس کے گھر تو واقعی سونا برسنے لگا تھا.....شروع شروع میں جب ان کا گھر نئی نئی چیزوں سے آشنا ہوا تو وہ کتنی مسرور ہوئی تھی۔ سارے محلے میں ان کی شان ہی کچھ اور ہو گئی تھی ..... سارے خاندان کی عورتیں اس سے جلنے لگی تھیں۔وہ ان کے حسد سے بے نیاز اپنی نئی نویلی خوشیوں میں مگن اپنے سوہنے رب کا شکر ادا کرتے کرتے تھک سی جاتی تھی۔''کیا ہم اس قابل تھے.....ان ساری چیزوں کے'' وہ چیزوں پر پیار سے ہاتھ پھیر پھیر کر سوچا کرتی۔

اور پھر نئی کوٹھی، نئے فرنیچر، نئے قالینوں کے ساتھ جب ایک میم سی عورت گھر کی ڈیکوریشن کرنے آئی تو وہ حیران حیران نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی.....ان عجیب و غریب مشینوں کو سنبھالنے اور سجانے کا سلیقہ بھلا اس میں کہاں تھا.....پھر گھر نوکروں سے بھرتا چلا گیا۔جہاں صفدر شاہ اپنے کاموں کے لیے اسے پکارا کرتا تھا اب ملازموں

کو پکارنے لگا۔شاید اتنے چہروں، اتنے ملازموں میں وہ اس کا نام بھول گیا تھا۔ اب وہ زینو سے ''بے وقوف عورت'' بن گئی تھی کیونکہ اسے سی ڈی پلیئر سے لے کر ویکیوم کلینر تک کے استعمال کا طریقہ معلوم نہیں تھا۔ جسے کار ڈرائیو کرتے ہوئے خوف آتا تھا اور جو بہت صبح اٹھ کر وضو کا لوٹا کھڑکانے لگتی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ ہاتھ میں کپڑے لیے خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے سوچنے لگی.....کہ کیا وہ واقعی بے وقوف نظر آنے لگی ہے۔ وہ کتنی بدل گئی تھی۔ اس کے بال چھوٹے چھوٹے لچھوں کی شکل میں گردن کے پاس پڑے تھے.....اگرچہ میک اپ کے فن میں اب وہ اناڑی نہیں رہی تھی۔ تھکن نے اس کے چہرے پر ڈیرے ڈال رکھے تھے اور یہ تھکن میک اپ کی شوخ تہوں میں بھی نہیں چھپ پا رہی تھی۔ وہ اب ۴۷ برس کی ہو چکی تھی۔ اب سے تیس برس پہلے صفدر شاہ سے اس کی شادی ہوئی تھی کلرک کی حیثیت سے پچیس سال گزارنے کے بعد شوہر کی اڑان کا ساتھ دینے کے لیے اس کے پاس بال و پر نہیں رہے تھے۔ بچوں کی پیدائش کے بعد ناقص غذا نے اس کے جسم کی ساری توانائیاں نچوڑ لی تھیں۔ مگر صفدر شاہ پچاس برس کا ہونے کے باوجود بہت توانا تندرست نظر آتا تھا..... بڑی بیٹی کی شادی کر دی تھی.....چھوٹے دونوں لڑکے پائن ہل سکول مری میں داخل ہو گئے تھے۔ بڑا لڑکا یونیورسٹی کا امتحان پاس کر کے برطانیہ چلا گیا تھا۔ فراغت ہی فراغت تھی مگر امنگ جیسے گہری نیند سو گئی تھی۔ دولت نے ان کے کتنے ہی ادھورے کاموں کو پورا کر دیا تھا.....لیکن اس کے اور صفدر شاہ کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج بھی حائل کر دی تھی۔ پہلے وہ ایک تھے مگر اب وہ دونوں علیحدہ علیحدہ شخصیتوں میں بٹ گئے تھے۔ پہلے وہ دونوں مل کر تھوڑی سی تنخواہ میں اکٹھے خرچ کرتے تھے.....ایک دوسرے پر اعتماد کرتے تھے .....محبت کرتے تھے.....مگر دولت ..... یہ دولت ایک پہاڑ کی طرح ان کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

جہاز اڑان کے پر تول رہا تھا۔ میٹھی سی آواز میں اناؤنسمنٹ گونج رہی تھی اور وہ اپنی بیلٹ باندھنے لگی۔ تبھی صفدر شاہ نے گردن موڑ کر بہت بے زار لہجے میں کہا۔

''اب پچھلی بار کی طرح مجھ پر الٹی نہ کر دینا۔ لفافہ لے کر منہ پر لے کر لو.....میرا دل بڑا خراب ہوتا ہے۔''

اس نے چپ چاپ اس کے حکم کی تعمیل کی۔

یہ وہی صفدر شاہ تھا جو شادی کے بعد کہا کرتا تھا کہ میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ دنیا کا خوبصورت تحفہ قدرت نے تمھاری شکل میں مجھے دے دیا ہے وہ وقت اسے بھولا نہیں تھا جب پہلی بار بس میں سوار ہو کر وہ اپنے سسرال آ رہی تھی تو اچانک اس کا جی متلانے لگا تھا۔ وہ الٹیاں کرنے لگی تھی.....صفدر اپنا سرخ رومال نکال کر اس کے ہاتھوں اور کپڑوں کو پونچھنے لگا تھا وہ کتنی شرمندہ ہو رہی تھی۔ مگر وہ کتنی محبت سے اسے تسلی دے رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں .....'' اس بات کا

اس کی سہیلیوں نے کتنا مذاق اڑایا تھا۔

مگر اب، اب ہر چیز بدل گئی تھی۔ صفدر علی اور وہ خود بھی۔ وہ ذرا دیر سے گھر آتا تو وہ کتنے رعب سے پوچھا کرتی تھی ''تم کہاں تھے اب تک؟'' پھر وہ روٹھ جایا کرتی تھی مگر اب، اب اگر وہ کئی کئی راتیں بھی گھر نہ آتا تو زینو کو پوچھنے کی جرأت نہیں تھی..... وہ ایک ہی بات کہہ کر اس کا منہ بند کر دیتا تھا۔

''ضروری کام تھا..... میرے کاموں میں دخل مت دیا کرو..... سمجھیں۔ مجھے بہت ضروری کام کرنا ہوتے ہیں۔ پیسہ بنانا خالہ جی کا کھیل نہیں ہے۔''

پہلے وہ شوہروں کی طرح برتاؤ کرتا تھا..... مگر اب وہ آقاؤں کی طرح بولتا اور بات کرتا تھا..... کتنا فرق ہو گیا تھا ..... اِس صفدر میں اور اُس صفدر میں..... دکھ اس کی پور پور میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اداسی تنہائی کا جنگل اس کے آس پاس پھیلتا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سرد ہونے لگے تھے۔ جسم کے ہر حصے میں اچانک درد کی لہریں اٹھ اٹھ کر سارے وجود کو گھیرے میں لینے لگی تھیں۔ اس نے بے ساختہ اپنے ہاتھ سینے پہ رکھ لیے اور اس کا سر ڈھلک گیا۔ اس کے کانوں میں آواز آئی۔ اس کا شوہر ایئر ہوسٹس کو بلا کر کہہ رہا تھا۔

''پلیز ذرا انھیں سنبھالیں۔ انھیں شاید ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔'' اور پھر اسے سیٹ پر لٹا دیا گیا۔ دو ہاتھوں نے اسے دوائی دی۔ جسے وہ تیزی سے نگل گئی اور پھر سو گئی..... اچانک ہی ایک تیز جھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی اور سوچنے سمجھنے سے پہلے ہی ایک اور دھماکا ہوا..... اس نے خود کو ہوا میں اچھلتے ہوئے محسوس کیا اور پھر تاریکیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

فنی خرابی کی وجہ سے پائلٹ نے جہاز کو زمین پر اتارنے کی کوشش کی۔ لینڈنگ کے دوران جہاز ایک جزیرے میں جا گرا تھا۔ جہاز کا ایک حصہ جھیل میں اور دوسرا زمین سے آ ٹکرایا تھا۔ یوں کم بلندی سے گرنے کی وجہ سے جھیل میں گرنے والے حصے کے مسافروں میں سے کچھ زندہ بچ گئے تھے۔

وہ شاید کسی کیڑے کے کاٹنے سے بیدار ہوئی تھی ایک موت کی سی غنودگی آمیز نیند نے اس کے اعصاب جکڑ لیے تھے..... وہ اپنے پیروں پہ بمشکل کھڑی ہو پائی..... اس کی آنکھوں کے سامنے اب ایک ناقابل برداشت منظر تھا۔ چاروں طرف جہاز کے پرزے بکھرے ہوئے تھے۔ جیسے کسی بچے نے کھلونے کو توڑ کر پھینک دیا ہو..... زمین اتنے انسانوں کا خون چوس کر بھی زرد اور بھربھری تھی۔ دور دور تک جلی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان پھنسے ہوئے انسانی اعضاء جہاز کی بربادی کی داستان سنا رہے تھے۔ اب کیا بچا تھا..... نہ کسی کا نشان، نہ پہچان۔ وہ کانپتی لرزتی دوبارہ مٹی پر گر گئی..... مگر بے ہوشی کا یہ وقفہ مختصر رہا ..... اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے..... جسم دھوپ میں جھلسنے لگا تھا تب اس نے آنکھیں کھولیں اپنے زندہ ہونے کو تسلیم کیا اور اپنے ذہن کو بیدار کیا اسے پانی کی

ضرورت تھی وہ لڑکھڑاتی ہوئی چند قدم چلی۔ پانی اس سے زیادہ دور نہ تھا.....وہ پانی میں سے تو نکل کر آئی تھی۔ ساتھ ہی جھیل تھی، آبی پرندوں کی میٹھی آوازیں اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھیں، وہ ڈگمگاتی دوبارہ پانی تک پہنچ گئی۔ پیاس بجھانے کے بعد دیر تک جھیل کے کنارے ہانپتی رہی۔ پھر اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی واپس جھلسے ہوئے میدان تک آ گئی۔ اتنے بڑے میدان میں وہ واحد متنفس کی طرح کھڑی تھی۔ غم زدہ، متحوش، اداس یہ سوچتے ہوئے کہ وہ کیوں زندہ ہے.....موت اسے بھی آ جاتی تو اچھا تھا آنسو آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ اس کا اپنا صفدر شاہ اس کا سہاگ کہاں تھا وہ دیوانہ وار ڈھونڈنے لگی۔ ایک پھٹا ہوا بیگ نظر آیا پھٹے ہوئے بیگ کی دھجیاں ادھر ادھر اڑ رہی تھیں جگہ جگہ انسانی جسم کے ٹکڑے منظر کی ہولناکی میں اضافہ کر رہے تھے اس نے دہشت سے آنکھیں بند کرنا چاہیں، رونا چاہا، چیخنا چاہا مگر وہ کچھ نہیں کر سکی.....اس کے اعصاب جیسے منجمد ہو گئے تھے اور تبھی گھنی جھاڑیوں کے اندر سے آتی ہوئی ایک کراہ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا .....وہ پاگلوں کی طرح جھاڑیوں میں گھستی چلی گئی.....یہ آواز تو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی.....صفدر شاہ لہولہان وجود لیے اوندھا پڑا تھا وہ بے ساختہ اس پر جھکتی چلی گئی۔ ''تم ٹھیک ہو.....؟ تم بول سکتے ہو.....؟ تم آنکھیں کھولو میں زندہ ہوں، میں تمھاری زینب، اٹھو دیکھو، کیسی قیامت برپا ہو گئی ہے۔'' مگر وہ اس کی باتیں نہیں سن پا رہا تھا۔ زینب نے اس کی پیشانی سے بہہ بہہ کر آنکھوں کے گرد جمع ہونے والے خون کو صاف کیا تو وہ اس قابل ہوا کہ آنکھیں کھول سکے.....مگر اس کے حواس ابھی اس کے قابو میں نہیں تھے۔ وہ اُسے بمشکل گھسیٹ کر درخت کے سائے میں لے آئی اور پھر جھیل کی طرف دوڑی۔

پانی حلق میں اترتے ہی صفدر شاہ کے چہرے پر زندگی کی چمک لوٹ آئی۔

☆.....☆.....☆

موت کے اس میدان میں اُنھیں تین زندہ افراد اور مل گئے تھے۔ زینب نے بڑی مشکل سے اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے بسکٹوں کے بچے کھچے پیکٹ اور خشک دودھ کے دو تین ڈبے اکٹھے کیے۔ زخمیوں کو پانی پلایا..... پانی کے لیے اس نے جہاز کی ایک لائٹ کا کور پیالے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ وہ یہ سب کام تنہا کر رہی تھی..... اسی ہولناک حادثے میں صفدر کی ٹانگیں بری طرح زخمی ہو گئی تھیں .....گو زخم خطرناک نہیں تھے مگر مرہم پٹی کی ضرورت تو تھی۔ اس نے جنگلی جڑی بوٹیوں سے مرہم بنا کر سب زخمیوں کو لیپ کیا۔ کپڑوں کی دھجیاں پٹیوں کی طور پر استعمال کیں۔ مگر اس کے باوجود اگلے روز دو زخمی جن میں ایک بارہ سالہ لڑکا بھی شامل تھا زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے تھے۔ ایک انگریز لڑکا جس کی عمر اس کے بیٹے کے برابر تھی کافی سنبھل گیا تھا۔ وہ زینو کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ دونوں نے مل کر جہاز کی بکھری اشیاء تلاش کیں۔ کچھ ضروری اشیاء کا ذخیرہ کر لیا لائٹر کی مدد سے وہ آگ جلانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ زینو نے دونوں مردوں کے

لیے کھانا تیار کیا جیسے ہی بھنی ہوئی مچھلی کی بو فضا میں پھیلی۔ ان تینوں کے چہرے زندگی کے بھرپور احساس سے دمک اٹھے۔ آگ کے دھوئیں سے اٹھنے والی دھوئیں کی لکیر زندگی کا پیغام لے کر آسمان کی طرف بلند ہو رہی تھی۔ وہ اس روز بہت خوش تھے۔ مرنے والوں کا غم دھل سا گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

باہر کی دنیا میں خبر بہت دکھ سے سنی گئی تھی کہ سوئٹزرلینڈ جانے والی فلائیٹ نمبر ۴۷۵۵ کا ابھی تک کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ بدنصیب مسافروں کی تصویریں دنیا بھر کے اخبارات میں دھڑا دھڑ چھپ رہی تھیں یہ اخبارات مختلف حاشیہ آرائی سے خبریں پیش کر رہے تھے۔ ان میں کچھ افواہیں بھی شامل تھیں مثلاً جہاز فلاں فلاں جگہ دیکھا گیا..... یا اُسے کسی باغی تنظیم نے اغوا کر لیا..... آخری پیغام جو آپریٹر نے موصول کیا تھا اس کی جانچ پڑتال ہو رہی تھی .....ان ساری باتوں کے ساتھ ساتھ جہاز کی تلاش میں دنیا کے مختلف ممالک کی ٹیمیں روانہ ہو چکی تھیں۔

☆.....☆.....☆

زینو اپنے شوہر کی تیمارداری بڑی تندہی سے کر رہی تھی۔ گو اس کے زخم خاصی حد تک مندمل ہو چکے تھے مگر وہ ابھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے کپڑے دھوتی بڑے پیار سے اس کا منہ دھلاتی۔ اس کے لیے جھیل سے تازہ مچھلی پکڑ کر لاتی اپنے ہاتھوں سے اُسے کھانا کھلاتی۔ زخموں کی دیکھ بھال بڑی توجہ سے کرتی.....مگر ان تمام باتوں کے دوران وہ خاموش رہتی۔ اگر کبھی صفدر بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ ہوں ہاں میں جواب دے کر پھر چپ ہو جاتی۔ انگریز لڑکا سارا دن شکار کے پیچھے گھومتا رہتا تھا ساتھ ساتھ وہ ایک جھونپڑی بنانے میں بھی مصروف رہتا۔ یوں بھی وہ اردو نہیں بول پاتا تھا تینوں ایک ہوتے ہوئے بھی جدا جدا لگتے تھے۔ صفدر کو اس خاموشی سے وحشت ہونے لگی تھی .....اس کا دل چاہتا تھا کہ زینو اس کے پاس بیٹھے۔ چاہے ایک وقت کا کھانا نہ دے مگر کوئی بات کرے۔ اس حادثے کے متعلق آئندہ زندگی کے بارے میں بیتے ہوئے دنوں کے قصے ..... کچھ بولے .....مگر وہ خاموش تھی۔ فالتو وقت میں وہ ڈیوڈ کے ساتھ جھونپڑی بنانے میں مصروف رہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس روز زینب جھیل سے مچھلی پکڑ کر لائی تھی۔ یہ وہ مچھلیاں ہوتی تھیں جو اچانک کائی میں پھنس جاتی تھیں انھیں پکڑنا آسان ہو جاتا تھا۔ ڈیوڈ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ صفدر کو بھوک لگ رہی تھی۔ وہ مچھلی آگ پر بھون کر پتوں پر رکھ کر لائی تو صفدر نے اسے روک لیا۔

''زینب.....کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟''

''زینب.....؟'' اس نام پر چونک کر اس نے اپنے شوہر کو دیکھا.....تو کیا اسے میرا نام یاد آ گیا..... کیونکہ یہاں نوکروں کی بھیڑ نہیں ہے..... یہ اس کے مصائب کا دور ہے.....تبھی میرا نام اس کی زبان پہ آ گیا آنسو اس کی

آنکھوں کی حد توڑ کر بہہ جانے کو بے تاب ہو گئے تھے۔ برسوں سے کھوئی ہوئی اپنائیت دوبارہ پا کر وہ بوکھلا سی گئی .....مگر صفدر کے سامنے وہ اپنی اس کمزوری کا اعتراف نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''یہ آج تمھیں میرا نام کیسے یاد آ گیا۔تم تو مجھے چند برسوں سے بے وقوف عورت کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ زینب تو میں صرف اس وقت تھی جب میں تمھاری غربت کی ساتھی تھی۔ تمھاری گندی بنیانیں اور کپڑے جرابیں دھویا کرتی تھی، تمھاری نسل کی افزائش کے قابل تھی۔تمھارے چھوٹے سے گھر کو صاف ستھرا رکھتی تھی اب تمھیں ہر کام کے لیے علیحدہ علیحدہ نوکر مل گئے ہیں۔ راتیں بسر کرنے کے لیے خوبصورت عورتیں مل گئی ہیں اب میری حیثیت کیا ہے؟ ایک بے وقوف عورت ، بے وقعت، بے قیمت یہ تم تھے جو کبھی کہا کرتے تھے.....کاش زینب میرے پاس اتنا پیسہ ہو کہ میں تمھارے قدموں میں نچھاور کر دوں، اب پیسہ آیا ہے تو مجھے معلوم ہوا کہ دولت نے تمھاری نظر میں ہر شے کی قیمت مقرر کر دی ہے اس لیے میری قیمت ایک پرانے گھسے پٹے فرنیچر سے بھی کم ہو گئی ہے میں صرف ایک کم عقل اور بے وقوف عورت کی حیثیت رکھتی ہوں۔ پھر یہ آج تم نے اتنے پیار سے زینب کہہ کر مجھے کیسے پکار لیا۔''

وہ یہ سب باتیں کہنا چاہتی تھی مگر زبان سے چپ کا تالا نہ ٹوٹ سکا۔

''تم کیا سوچنے لگیں .....'' اس نے اپنی اشکبار نظریں اٹھا کر صفدر کو دیکھا۔ٹانگوں کی تکلیف نے اسے کتنا کمزور اور زرد کر دیا تھا۔کیا گلہ کرنے کا یہی وقت ہے۔اچھا ہوا..... یہ الفاظ آواز نہیں بنے کیا خدا کا شکر ادا کرنے کو یہ کم ہے کہ وہ زندہ ہے جو بیت گیا سو بیت گیا۔اگر صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے ۔اب وہ کتنے پیار سے اسے پاس بٹھاتا ہے کتنے ممنون لہجے میں کہتا ہے.....''تم تو میری مسیحا ہو اور آج اس نے کتنے لاڈ سے مجھے میرے نام سے پکارا ہے ۔خطائیں تو معاف کرنے کے لیے ہی ہوتی ہیں زینب کے دل میں پیار کے جھرنے پھر سے پھوٹنے کو بے تاب ہو گئے۔

''مجھے معلوم ہے تم کیا سوچ رہی ہو..... میں شرمندہ ہوں زینب کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ مجھے قدرت نے اس غفلت کی سزا دی ہے جو پچھلے کئی برسوں سے میں تم سے کرتا رہا ہوں .....اب میں سوچتا ہوں کہ جب واپس جاؤں گا .....اگر بچ گیا تو تمھارے نام پہ ایک ہسپتال بنواؤں گا۔ یہ تمھاری اس محبت کا صلہ ہوگا جو تم مجھ سے کرتی ہو، انہی دنوں کی یادگار وہ ہسپتال پورے ملک میں تمھارے نام سے مشہور ہوگا۔سینکڑوں لوگ میری زینب کو دعائیں دیا کریں گے۔''

دل کی بنجر زمین یکلخت لہلہا اٹھی تھی ..... سنگلاخ چٹانوں سے محبت کے سوتے پھوٹ نکلے۔ زینب کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو بہنے لگے۔

ایک ماہ گزر گیا تھا۔ڈیوڈ کے بازو پہ زخم کے گہرے نشان بگڑتے جا رہے تھے۔وہ شکار کرنے سے معذور ہو گیا

تھا۔اب سارا کام زینب کے حصے میں آ گیا تھا۔ڈیوڈ سارا دن درخت کی چھاؤں میں بیٹھا لکڑیاں اور پتے الاؤ میں پھینکتا رہتا.....اس کی نظریں آسمان پہ بھٹکتی رہتیں کہ شاید کوئی طیارہ یا ہیلی کاپٹر اُن کی تلاش میں آ نکلے۔ اگر بر وقت اس کا علاج نہ ہو سکا تو وہ سسک سسک کر مر جائے گا' اُ وہ دکھ سے سوچتا رہتا۔ یہ عورت اپنے شوہر کی تیمارداری میں کتنی مگن اور مسرور ہے۔دونوں گھنٹوں جانے کہاں کہاں کے قصے سناتے رہتے ہیں.....کاش مجھے اُن کی زبان آتی یا یہ عورت میری اپنی قوم کی ہوتی تو یہ تنہائی اتنی بھیانک نہ ہوتی۔صفدر شاہ زینب کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر بڑی مسرت سے کہتا۔ پتا نہیں ہم واپس جا بھی سکیں گے یا نہیں مگر اب مجھے پرواہ نہیں ہے۔تم میرے ساتھ ہو۔ یہاں تو موت بھی آسان ہو جائے گی۔شہر نے مجھے تم سے دور کر دیا تھا.....مگر اس جنگل میں تم نہ ہوتیں تو میں کب کا مر چکا ہوتا.....تم دل ہی دل میں کہتی ہو گی.....کہ میں کتنا خود غرض ہوں۔

''آپ ایسی باتیں نہ کیا کیجیے.....'' زینب اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتی۔

''اب مجھے اپنے مرنے کا غم نہیں ہو گا.....دکھ صرف یہ ہے کہ میں تمھیں کوئی سکھ نہ دے سکا۔میری دولت نے تمھیں غم ہی غم دیے.....شاید قدرت مجھے ایک بار پھر تلافی کا موقع دے یا نہ دے کیا معلوم۔''

''صفدر تم اتنے مایوس کیوں ہوتے ہو.....'' زینب پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیتی۔

''تمھاری باتیں مجھے حوصلہ دیتی ہیں۔ زینب تم میری نظروں کے سامنے رہا کرو۔ ہر وقت باتیں کرتی رہا کرو۔'' صفدر اسے اپنے قریب بٹھا لیتا۔

☆.....☆.....☆

وہاں جنگل تھا، اداسی تھی، تنہائی تھی، کسمپرسی تھی مگر زینب کے چہرے سے اداسی کی دھول چھٹ چکی تھی۔وہ ہر دم تر و تازہ و چاق و چوبند رہتی۔صبح سے شام تک وہ دونوں مریضوں کے کام کرتی مگر تھکن نے کبھی اسے نڈھال نہ کیا اس کے لبوں پہ مسکراہٹ نے بسیرا کر لیا تھا۔کئی ماہ پہلے ڈاکٹروں نے اس کے شوہر سے کہا تھا کہ تمھاری بیوی کو ہارٹ پرابلم ہے.....مگر اب اس کے دل نے جھٹکے کھانا بند کر دیے تھے گھٹن جاتی رہی تھی.....کتنی سبک رفتاری آ گئی تھی اس کی زندگی میں۔

☆.....☆.....☆

اور پھر دو ماہ بعد ایک ہیلی کاپٹر نے اس جزیرے پر چکر لگایا ڈیوڈ نے شور مچایا اور پھر اس کی گڑگڑاہٹ میں اضافہ ہوتا چلا گیا.....ڈیوڈ کی جلائی ہوئی آگ اور اس کا دھواں رہبر بن گیا تھا۔

''ہیلی کاپٹر.....ہیلی کاپٹر، وہ دیکھو، اس طرف۔'' صفدر پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا.....''ہمیں دیکھ لیا گیا ہے ہمیں دیکھ لیا گیا ہے۔'' وہ خوشی سے زمین پر دیوانوں کی طرح گھسٹ رہا تھا اور اس سمت بڑھ رہا تھا جہاں گرد و غبار نے گھیرا ڈالا ہوا تھا۔

ڈیوڈ بازو ہلا ہلا کر چیخ رہا تھا۔

زینب جھیل پر اپنے کپڑے دھو رہی تھی.....وہ برہنہ حالت میں تھی اس لیے فی الفور سامنے نہیں آ سکتی تھی..... جلدی جلدی گیلے کپڑے لینے بھاگتی آئی .....اب گرد صاف ہو چکی تھی۔ ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھل چکا تھا۔ زندگی کی نوید لیے دو مسکراتے چہرے انھیں موت کی وادی سے نکالنے آ پہنچے تھے۔ صفدر اور ڈیوڈ وہاں پہنچ چکے تھے زینب بھی بھاگتی دوڑتی ان تک پہنچ گئی۔ صفدر اسے دیکھتے ہی چلایا۔

او بے وقوف عورت تم جھیل پر اتنی دیر سے کیا کر رہی تھی.....کیا تمھارے کان بہرے ہو گئے ہیں .....اب جلدی کرو.....تمھیں آوازیں دے دے کر میرا حلق خشک ہو گیا ہے.....کیا آج ہی دھونے تھے کپڑے۔

اور زینب کو اچانک یوں محسوس ہوا جیسے اس کے گیلے کپڑوں سے پانی نہیں دل صد چاک کا لہو بوند بوند ٹپک رہا ہے۔ اپنے سینے پہ ہاتھ رکھے وہ چند قدم چلی اور دو ہاتھوں نے اسے گرنے سے پہلے تھام لیا.....ہیلی کاپٹر کی گھر گھر میں اُسے آواز آئی.....

''بہت خوشی بھی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔''

☆☆

وہ ایک انداز تیرا

''مانی! تمھیں معلوم ہے میں کیوں ماریو اور طلعت کے ساتھ کے حق میں ہوں کیونکہ.....عثمان ملک اس دن اسکائپ سے بات کرتے ہوئے چپ ہو گئے جیسے الجھ گئے ہوں کہ مزید کیا کہیں۔ میمونہ خاموش اضطراب میں تھیں کہ عثمان اب کیا کہتے ہیں۔

''مانی! عباس کا باپ ان لڑکوں میں سے ایک تھا جن کی ہنسی میرے ذہن میں آج بھی گونجتی ہے تو میں اذیت محسوس کرتا ہوں۔ بے شک وہ اسکول کا دور تھا جو گزر چکا۔ بے شک اس نے کوئی لفظ نہ کہا پر مانی وہ ہنسنے والوں میں شامل تھا۔ چاہے مانی، وہ ایک مرتبہ ہی ہنسا لیکن وہ بہت زور سے ہنسا تھا اور اس نے مجھے دیکھا بھی ایسے تھا کہ اس کی نگاہیں مجھے جلتی ہوئی تیلیاں لگی تھیں۔ وہ اسکول کا ہیڈ بوائے تھا، کیا ہیڈ بوائے ایسے ہوتے ہیں مانی؟''

عثمان ملک کے جملے میمونہ کو دل کی گہرائیوں تک جاتے محسوس ہو رہے تھے۔ خود ان کے انداز میں وہ معصومانہ رنگ تھا جیسے کوئی انسان اپنے غم خوار سے دل کا حال سناتے اپنے مرتبہ اور مقام سے بے نیاز ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی ہو جو اس کے درد کی دوا کرے۔ اس وقت میمونہ کو اندازہ ہوا کہ کیوں ان کا بھائی ایسا ہے، کیوں وہ لوگوں سے، جو اس کی قدرتی خامی کو اپنا مذاق بنا کر تسکین پاتے ہیں یا تھے، کٹ کر رہنا چاہتا ہے۔ انھیں عثمان ملک ایک آزردہ سا بچہ لگا جو طاقتور سے مقابلہ نہ کر سکتا ہو۔

''مانی اس دن سے میں نے کئی مرتبہ اپنے اللہ سے کہا تھا کہ یہ سب جو مجھے دکھ دیتے ہیں آپ ان کو بھی میری طرح دکھ دیجیے۔ یہ بھی ہکلے ہو جائیں لیکن کوئی بھی ہکلا نہ ہوا۔ الٹا عامر میرا اپنا بہنوئی بن گیا، لیکن مجھے یقین ہے مانی کہ میری دعا کی لہریں بدستور طاقتور ہیں۔ وہ سب جنھوں نے انسانوں کا مذاق اڑانے پر توجہ نہ کی ہو گی اور میرا بھی مذاق اڑایا تھا وہ ضرور گرفت میں آئیں گے۔''

عثمان ملک کی آواز میں دکھ، شکوہ، غصہ تھا لیکن آواز سرگوشی کی سی دھیمی ہو چکی تھی۔

میمونہ گنگ سی بھائی کو سن رہی تھیں۔ ان کی اذیت ابھی تک زندہ تھی۔ وہ حیران تھیں۔ اتنے کامیاب شخص کا دل ابھی تک افسردہ ہے۔ وہ ششدر تھیں، جواب کے الفاظ تک ان کے پاس نہ تھے۔ اسکرین کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم ہو گئی تھیں۔

''مانی میں نہیں چاہتا کہ میں نے جس شخص کو اتنے برے الفاظ میں یاد کیا تھا اس کی نسل میں میری طلعت کی شادی ہو، میں آپا کی شادی میں شریک نہ تھا۔ ورنہ شاید

میں یہ شادی بھی نہ ہونے دیتا۔ میں تو ان سب لڑکوں کے نام بھی نہ جانتا تھا جو مجھے عثمان نہ کہتے تھے۔ یا ہنستے تھے مجھ پر۔ مجھے تو پتہ ہی نہ تھا کہ عامر میرے ہی خاندان میں آ جائے گا۔''

عثمان ملک کا چہرہ یکا یک سرخ ہوتا میمونہ کو محسوس ہوا۔

''اب کیسے عباس محمود کو جو کہ عامر محمود کا بیٹا ہے طلعت جیسی پیاری اور قیمتی بیٹی دے دی جائے۔ مانی کچھ تو سوچو۔''

میمونہ کو عثمان ملک برسوں پرانے وہی مان بھائی لگے جو کتنے دلار سے اسے مانی کہتے اور اپنی بات منواتے تھے۔ وہ محض چودہ برس کی تھیں جب مان بھائی چلے گئے تھے اور جب سے کسی نے بھی انھیں مانی نہ کہا تھا۔ اتنے برسوں بعد بھائی نے پکارا تو بھی ایسے موقع پر جب کہ الجھن اتنی گنجلک ہو رہی تھی کہ کوئی حل فی الحال نظر نہ آتا تھا وہ یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ مان بھائی، عباس ایسا نہیں ہے وہ واقعی بہترین لڑکا ہے۔ عثمان ملک کو جذبات کے اس دوراہے پر ٹوکنا ان کو اپنے بس میں نہ لگ رہا تھا۔

زمانہ بیتا جب وہ باتیں کرتے تھے، پھر تو بس رسمی سی گفتگو ہی ہوتی تھی۔ وہ بھی سال میں ایک آدھ مرتبہ عید کے عید یا بہت ہوا تو پردیس میں بیٹھ کر دیس سے ملی کوئی ناخوشگوار خبر پڑھ کر یا سن کر حال چال معلوم کرنے کے لیے مخصوص جملوں پر مشتمل بات کر لی۔ اب اپنائیت سے بات بھی ہو رہی تھی تو میمونہ عجیب دوراہے پر تھیں۔ بھائی کے جذبات اپنی جگہ اور بہن سے تعلق اپنی جگہ۔ بیٹی کی خوشی کا خیال بھی بہت اہم تھا۔

''اچھا مانی اولاد تمھاری ہے فیصلہ بھی تم نے ہی کرنا ہوگا۔ اللہ اسے ہمیشہ عافیت میں رکھے۔''

عثمان ملک کی آواز میں میمونہ کو لگا تھکان سی اتر آئی تھی۔ بھائی سے بات کر کے ان کا دل اندیشوں میں آ گیا تھا۔

''لیکن عامر بھائی اور عباس تو ایسے نہیں ہیں۔ مان بھائی حساس بہت ہو گئے ہیں۔''

انھوں نے اپنے شوہر سے بھائی کی گفتگو سناتے تبصرہ کیا تو ان کے شوہر علی نواز نے بیوی کو خاموش نظروں سے بغور دیکھا جہاں تفکرات نمایاں ترین تھے۔

''میمونہ عامر بھائی ایسے ہی ہیں جیسے تمھارے بھائی نے کہا ہے۔'' شوہر کی بات سن کر میمونہ نے تحیر کے عالم میں انھیں دیکھا۔

''وہ ایک کامیاب شخص ہیں بظاہر ہر لحاظ سے۔ اخلاقی قدریں بھی خاصی نمایاں نظر آتی ہیں لیکن بس اس حد تک جہاں تک وہ رکھنا چاہتے ہیں، ورنہ میں نے بھی ان کو کئی مواقع پر ہنسی مذاق کے نام پر خاصے دل آزار جملے کہتے لوگوں کے ساتھ دیکھا ہے۔ یہ اپنے آپ کو ہنرمندی سے اوٹ میں رکھتے ہیں۔ منہ سے کچھ نہیں بولتے لیکن جتھے کے ساتھ ضرور شامل رہتے ہیں۔''

علی نواز آج کیا کہہ رہے تھے میمونہ کے لیے خاصی

افسوس ناک باتیں تھیں۔ عامر بھائی کے لیے، ان کے اس بہنوئی کے لیے جس کی خوش اخلاقی، دوست پروری کا سکہ سب ہی مانتے تھے، ان عامر بھائی کے لیے ان کے اپنے بھائی عثمان ملک نے بھی متضاد بات بتائی جس کو شاید وہ ان کی حساسیت کہہ کر ختم کر دیتیں لیکن اپنے شوہر کی بات نظر انداز کرنا ناممکن تھا، کیونکہ عامر بھائی کی خوش اخلاقی اور دوست نوازی پر کبھی بھی انھوں نے کوئی خفیف سا بھی منفی اشارہ نہ دیا تھا۔ عباس کے ساتھ منگنی پر بھی وہ بہت خوش تھے اور اب وہی علی نواز ایسا کہہ رہے تھے۔

''عامر کے ساتھ کتنے لوگوں کے دل سے نکلی بد دعائیں بھی جڑ سکتی ہیں۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا میمونہ! ہنسی مذاق میں بظاہر کیے جانے والے طنز پر کوئی ان کو جواب دینے کے بجائے اپنا مقدمہ رب کے حضور پیش کر سکتا ہے مجھے کبھی گمان بھی نہ گزرا تھا۔ عثمان کے اس طرح کہنے سے مجھے بھی اپنا محاسبہ کرنا پڑے گا، نہ جانے میں نے بھی بظاہر ہنسی مذاق میں کسی کی قدرتی کمی پر اس کی کبھی دل آزاری نہ کی ہو اور میرے ساتھ بھی اس کی آہیں گردش میں ہوں۔'' علی نواز کی آواز میں سوچ نمایاں تھی۔ جبکہ میمونہ حیران تھیں کہ کیا یہ باتیں بھی المیہ کو جنم دے سکتی ہیں، وہ محفلیں رنگین وہ ہنسی مذاق، یاری دوستی کے نام پر وہ طنز، شغل اور مزے کے لیے کسی انسان کے دل کو اپنے الفاظ سے شکار کرنا! کیا کیا فساد پیدا کرتا ہے۔ انسان نہ سوچتا ہے اور نہ سوچنا چاہتا ہے بلکہ تاویلات ہی گھڑتا ہے۔ کیا یہ تاویلات کوئی جواب دے سکتی ہیں جب اللہ رب العزت کی کتاب میں یہ درج ہے کہ ''خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے کے لیے'' سورۃ ھمزہ میں اتنی ناراضگی اللہ پاک نے ظاہر کی ہے کہ تم کون ہوتے ہو میری تخلیق پر انگلی اٹھانے والے! اور تمھارے لیے خرابی ہے (ہر طرح کی) اگر کسی کو اپنے کسی بھی انداز سے بے آرام کیا، سلامتی سے محروم کیا۔

میمونہ نے کتنی ہی بار یہ سورہ تلاوت کی تھی۔ لیکن مان بھائی کی آواز ان کے کانوں میں اس وقت گونجنے لگی۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں جب یہ کہا تھا تو میمونہ نے سوچا تھا کہ

''مان بھائی وہ وقت گزر گیا، جب آپ کا مذاق بنایا گیا تھا۔ دنیا تو ایسے کرتی ہی ہے۔ انسان کو ان سے مقابلہ کرنا آنا چاہیے۔ آپ کیا پرانی باتیں دل پر لے کر بیٹھے ہیں۔''

لیکن یہ سب انھوں نے کہا نہیں صرف مان بھائی کے دل کی بے کلی ان کو بے کل کر گئی تھی۔ انھوں نے انسانی فطرت کے لیے الفاظ کے غلط چناؤ کے اثرات کو محسوس کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ بدصورت الفاظ کی گندگی دوسرے انسانوں پر کیا اثرات ڈال سکتی ہے، ان کو کیسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتی ہے، چاہے وہ اوپر سے، سطح سے کتنے ہی بہتر حالت میں ظاہر ہوں، بہرحال نشانہ بننے والا انسان اندر سے اجڑ جاتا ہے۔ آخر کن حقوق کے تحت ان کو مزے کے نام پر اللہ مرجھانے دے یقیناً

وہ محبت کرنے والا رب کسی کے ساتھ بداخلاقی اور برائی برداشت نہیں کرتا۔

جتنا جتنا وہ سوچتی جا رہی تھیں، ایسے ایسے زاویے ابھر رہے تھے کہ عمومی حالات میں شاید کیا بلکہ بالیقین ان پر وہ نہیں سوچتیں۔ مان بھائی کی دلی کیفیت میمونہ کو اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ رگوں میں جیسے وہ تکلیف پھیلتی لگ رہی تھی جیسے کسی نے ان کو مذاق اور تفریح کے نام پر نشانہ پر رکھ لیا ہو۔ یہ ہکلے کی بہن ہے۔'' ''بیچارے اس کے بھائی کو چھوٹا سا جملہ کہنے میں بھی گھنٹہ لگ جاتا ہے۔'' ''اوہ بھئی ہکلا نہیں بلکہ بیچارے ماں باپ کی آزمائش کہا کرو اس کو تو!''

میمونہ کے کانوں میں یہ آوازیں گونجنے لگیں جو ان کے خیال نے تخلیق کی تھیں۔ اس خیال نے جو یہ محسوس کر رہا تھا کہ اردگرد کی دنیا میں انسانوں کی کثیر تعداد اپنے ہی جنس کو کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی تفریح کا نشانہ بنا کر انسانوں کی زندگی کو تلخیوں اور پیچیدہ ترین الجھنوں میں ڈال دیتی ہے۔ جیسا میرا بھائی ہم سب سے علیحدہ دنیا بسا کر بیٹھ گیا۔

ایک گہری سانس لے کر میمونہ نے اپنے شوہر کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔ وہ کچھ ہی فاصلہ پر بیٹھے سوچ میں گم تھے۔ میمونہ ان کو لمحہ بھر بغور دیکھتی رہیں۔ اچانک علی نواز نے فون کانوں سے لگایا۔

''جی عامر بھائی السلام علیکم!'' میمونہ ان کے اس طرح فون ملانے سے برافروختہ ہو گئیں کہ انھیں معلوم تھا کہ ان کے میاں نے اگر کوئی فیصلہ کر لیا ہو گا تو وہ اس پر جمے رہیں گے، اب نہ جانے کیا بات وہ عامر بھائی سے کرنا چاہیں۔ ''ہم آپ کے ہاں کل شام آئیں گے۔ بہت عرصہ ہو گیا گپ شپ لگائے۔'' مزید ایک آدھ بات کر کے انھوں نے فون بند کر دیا اور بستر پر لیٹ گئے۔

اگلی شام میمونہ میاں کے کہنے سے پہلے ہی جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھیں۔ علی نواز نے دیکھ لیا تھا کہ میمونہ ان کی بات سن چکی ہیں، مزید تبصرہ نہ انھوں نے کیا اور نہ وہ کرنا چاہتے تھے۔ بس بیوی کو اگلے دن وقت پر تیار پا کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری جسے دیکھ کر میمونہ نے خوشگواریت سی محسوس کی۔ حالانکہ بہن کے ہاں جانے کے معاملہ پر علی نواز ہنوز خاموش تھے۔ میمونہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ فوری اور غیر متوقع پروگرام میاں نے کس سوچ کے تحت اچانک بنا لیا ہے۔ میمونہ بھی ایک سمجھدار بیوی کی طرح یہ جان چکی تھیں کہ علی نواز اس موضوع پر کوئی بھی بات نہیں کریں گے اس لیے انھوں نے بنا حجت کیے بہن کے ہاں لے جانے کے لیے مرغی روسٹ کر لی۔ راستے میں سے آئس کریم کیک خریدتے ہوئے وہ دونوں عامر بھائی کے ہاں پہنچ گئے۔ خالی ہاتھ جانا علی نواز کو کبھی پسند نہ تھا۔ خصوصاً جب سے سمدھیانہ بنا تھا۔ میمونہ نے بھی اسی ترتیب سے سارا انتظام کر لیا تھا۔

جب وہ عامر بھائی کے ہاں پہنچے تو ان کے

ڈرائنگ روم میں کوئی اجنبی صورت موجود تھی۔ چند لمحوں بعد ہی وہ صاحب عامر بھائی اور میمونہ کی بہن فرزانہ سے گرمجوشی سے الوداعی کلمات کہہ کر رخصت ہو گئے۔ علی نواز اور میمونہ کو دیکھ کر فرزانہ اور عامر بھائی دونوں ہی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

''آیئے آیئے بھئی زہے نصیب، آج تو بڑے عرصہ بعد آپ کا آنا ہوا۔'' ہاتھ میں پکڑے کارڈ کو انھوں نے سامنے میز پر رکھ دیا۔

''کون تھے یہ صاحب؟'' علی نواز نے سرسری لہجے میں پوچھا۔ اسپلٹ کی خوشگوار ٹھنڈک کمرے میں پھیلی تھی کہ اچانک بجلی چلی گئی۔

''بچے وغیرہ کہاں ہیں۔'' میمونہ نے عباس کی غیر حاضری محسوس کرتے پوچھا، ساری ٹھنڈک لمحوں ہی میں گھٹن شروع ہو گئی تھی۔

''یہ جو صاحب آئے تھے نا، ہمارے حلقہ میں سنگھاڑا کے نام سے جانے جاتے ہیں۔'' عامر بھائی نے قہقہہ لگاتے ہوئے علی نواز کی بات کا جواب دیا۔

''رکشہ سے آیا تھا بیچارہ بیٹے کی شادی کا کارڈ دینے۔ میں نے شارق کو کہا ہے کہ گھر چھوڑ آئے، بیچارہ اور زیادہ پکا ابلا سنگھاڑا بن جائے گا تھک تھکا کر۔'' علی نواز کے چہرے پر بے اختیار ان صاحب کی سیاہی مائل رنگت پر عامر بھائی کا ایسا تبصرہ سن کر ناگواری کا تاثر ابھرا ہی تھا جسے انھوں نے فوراً ہی دبا دیا۔

''شارق بس آتا ہی ہوگا۔''

جنریٹر آن ہو چکا تھا۔ خاصی پاور کا تھا اسپلٹ بھی کام کرنا شروع کر چکا تھا۔ ''لگتا ہے شارق آ چکا ہے۔'' فرزانہ نے باہر سے آتی آواز کو سن کر کہا تو میمونہ بے اختیار مسکرا اٹھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کے اس بھانجے کو ان کے ہاتھ کی روسٹڈ مرغی بہت پسند ہے۔ جلد ہی ملکی سیاست پر علی نواز اور عامر بھائی کی گفتگو شروع ہو چکی تھی۔ شاید علی نواز عباس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ شارق بھی خالہ خالو سے مل کر کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ میمونہ اور فرزانہ خاندان میں ہونے والے واقعات پر ایک دوسرے کو معلومات دے رہی تھیں۔

''ہاں تو میمونہ طلعت کی واپسی کب تک ہے۔ ہم عباس کی شادی اسی سال موسم سرما میں کرنا چاہتے ہیں۔'' عامر بھائی نے میمونہ کو مخاطب کرتے ہوئے علی نواز اور میمونہ دونوں کو باری باری دیکھا تو علی نواز نے کھنکار کر حلق صاف کیا۔

''عامر بھائی بات یہ ہے کہ میں اور میمونہ آپس میں کزنز بھی ہیں اور اب طلعت اور عباس کا رشتہ بھی کزنز کے درمیان کا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اس طرح خاندانی بیماریاں اگلی نسل میں منتقل ہونے کا خاصا خطرہ ہوتا ہے۔ میرے والدین بھی آپس میں رشتہ دار تھے۔''

علی نواز نے اتنی بات کہہ کر عامر بھائی کو دیکھا جو الجھی نظروں سے علی نواز کو دیکھ رہے تھے۔ اور علی نواز کو اپنے اعصاب تنے واضح محسوس ہو رہے تھے۔ فرزانہ بھی سپاٹ تاثرات کے ساتھ بہنوئی کو دیکھ رہی تھیں۔ عباس

اسی لمحہ کمرے میں سلام کرتا داخل ہوا۔ دھیمی سی آواز میں وعلیکم السلام کی آوازیں ابھریں جن میں پراسراریت سرسرا رہی تھی۔

''تو بس میں یہ چاہتا ہوں کہ طلعت اور عباس کی نسل میں کوئی بیماری منتقل نہ ہو۔ اس لیے ہم یہ رشتہ ان بچوں کے حق میں مفید اور بہتر نہ سمجھتے ہوئے ختم کر رہے ہیں۔'' علی نواز کی آواز ہلکی ضرور تھی لیکن پختہ تاثر اس میں محسوس کیا جا سکتا تھا۔ ان الفاظ کی بازگشت شاید ابھی شروع بھی نہ ہوئی ہو لیکن کمرے میں بیٹھے نفوس ساکت ہو چکے تھے۔

''علی نواز آپ کو ڈھائی سال بعد یہ حقیقت یاد آ رہی ہے کہ آپ خود کیا ہیں اور ہم کیا ہیں۔'' فرزانہ نے بے یقین نظروں سے میمونہ کو دیکھا جو خود ان الفاظ کے دھماکوں کی زد میں تھیں، جبکہ عامر بھائی کا چہرہ ضبط کے باوجود طیش سے سرخ ہو چکا تھا۔

''آپ یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے تاویلات دینے کی کیا ضرورت ہے۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ لوگوں کو اب یہ رشتہ پسند نہیں رہا۔''

عامر بھائی کا لہجہ سلگ رہا تھا۔ جبکہ عباس بھی خاصا برہم دکھائی دے رہا تھا لیکن ماں بیٹا دونوں نے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکالا۔ ان کو معلوم تھا کہ عامر اور علی نواز کے درمیان اگر وہ بھی بول پڑے تو رشتہ داری کا بھرم لمحہ بھر میں ختم ہو جائے گا۔ اور وہ علی نواز جیسی بااثر شخصیت سے قطع تعلق کے بگاڑ کا خطرہ مول نہ لے سکتے تھے۔ شہر کے قیمتی علاقوں میں موجود ان کی جائیدادیں، ان کا حلقہ احباب، ان کے کاروباری تعلقات اور ان سے رشتہ داری عامر بھائی کے لیے خاصی اہمیت رکھتی تھی۔ ورنہ علی نواز کی واجبی سی شکل صورت کے آگر عامر بھائی کو اپنی شاندار شخصیت کا واضح احساس تھا۔ ''حیرت ہے کوئی ایک بچہ بھی باپ پر نہیں گیا۔'' وہ میمونہ کے بیٹوں اور طلعت کی خوبصورتی دیکھ کر اپنی بیوی فرزانہ سے کہہ ہی دیتے تھے۔

علی نواز اپنی بات کہہ کر خاموش ہو چکے تھے۔ جبکہ دوسرے فریق کا غصہ فطری تھا۔ ''خالو بہت اچھا ہوتا اگر آپ ہم سے براہ راست یہ کہہ دیتے کہ طلعت نے جرمنی میں ہی کسی اور کو منتخب کر لیا ہے تو زیادہ بہتر تھا۔'' عباس قہر بھرے لہجے میں یہ کہتا کمرے سے نکل گیا۔

علی نواز نے کمال ضبط کے ساتھ اس کو جاتے دیکھا جبکہ فرزانہ اور عامر بھائی کچھ سراسیمہ سے اسی رخ پر دیکھنے لگے جہاں سے عباس گیا تھا۔ ''معاف کیجیے گا علی نواز عباس زیادہ جذباتی ہو گیا ہے۔ اتنے عرصہ کی منگنی سے وابستگی ہو ہی جاتی ہے اور پھر ایسی بات ہو تو جوان خون ابل جاتا ہے۔'' عامر بھائی کے الفاظ میں بے شک معذرت تھی مگر لہجہ سے عباس کے الفاظ کی بازگشت نمایاں تھی۔

میمونہ کے چہرے پر سہمے سے تاثرات لرز رہے تھے۔ جبکہ فرزانہ سپاٹ نظروں سے ماحول میں موجود

تھیں۔

''ہم اتنے بے خبر بھی نہیں جتنا آپ لوگ سمجھ رہے ہیں۔کلون بے شک یہاں سے ہزاروں میل دور ہے لیکن باخبر رہنے کے لیے فاصلے نہیں فکر معنی رکھتی ہے۔ ہمیں اپنی ہونے والی بہو سے محبت اور فکر نے لاپروا نہیں رکھا تھا اگرچہ عثمان بھائی سے ہمارے آپ لوگوں جیسے گہرے مراسم تو نہیں۔'' لفظ گہرے پر فرزانہ نے زور دے کر بہن بہنوئی کو دیکھا جو نظریں جھکائے بیٹھے ان نازک لمحات کے عافیت سے ٹل جانے کی دل ہی دل میں دعائیں کر رہے تھے۔ بیٹی پر حرف آنا خاصا چبھ رہا تھا۔لیکن بات یکسر غلط بھی نہ تھی سو وہ اسے جھٹلا بھی نہ سکتے تھے۔

''ٹھیک ہے ہماری طرف سے بھی کوئی اصرار نہیں، آپ اور آپ کی بیٹی کی جو مرضی ہو کرے۔ ہمارے لیے بھی کوئی کمی نہیں۔ ہم نے اپنے لمبے قد بت والے شاندار بیٹے کے لیے طلعت کا انتخاب محض اس لیے کیا تھا کہ خاندان کی بچی ہے ورنہ کہاں طلعت کا قد اور کہاں عباس کا'' فرزانہ کے الفاظ نے علی نواز کو جیسے بارود دکھا دیا تھا۔وہ اچانک کھڑے ہوئے، سالی کو ہاتھ سے چپ رہنے کو کہا اور بیوی کو چلنے کا اشارہ کر دیا۔

''ہم یہ رشتہ بے شک ختم کر رہے ہیں لیکن میرا پرانی رشتہ داریاں ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں، اب یہ آپ لوگوں پر ہے کہ رویے کس قسم کے رکھتے ہیں ہاں ایک بات میں واضح کر دینا چاہتا ہوں ۔آج کے بعد سے بلکہ ان لمحات کے بعد سے اگر میری بیٹی کے حوالے سے کچھ بھی منفی آپ لوگوں نے کسی سے کہا تو بہت معذرت کے ساتھ میں بھی اس بات کا پابند نہ رہ سکوں کہ زبان خاموش رہے۔لبنیٰ نے بھی پسند کی شادی کی تھی جس میں آپ لوگوں کی رضا نہیں تھی۔''

علی نواز کا لہجہ برف کا سا یخ تھا مگر فرزانہ اور عامر بھائی کے تن بدن میں جیسے شعلے لپک اٹھے۔وہ ششدر بھی تھے کہ سمجھتے تھے کہ یہ بات ان کے گھر کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ لبنیٰ کی شادی پسند کی تھی۔لبنیٰ ان کی بھی اکلوتی بیٹی تھی۔ماں باپ کے نہ ماننے پر اس نے طوفان کھڑا کر دیا تھا۔

''ہم بھی خاصے باخبر ہیں عامر بھائی اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ راضی ہی جب ہوئے جب اس نے ایک رات اپنی دوست کے ہاں گزاری اور گھر نہیں لوٹی کالج سے۔کوئی زیادہ پرانی بات تو نہیں بس چار سال ہی تو گزرے ہیں۔''

علی نواز کے لہجے میں اب جتانے والا انداز تھا جبکہ میمونہ کے لیے یہ انکشاف تھا کہ ان کے شوہر نے اشارتاً بھی کبھی کوئی ایسی بات نہ کی تھی یہاں تک کہ عباس سے طلعت کے رشتہ کے وقت بھی ان کے ہونٹوں پر عامر اور فرزانہ کے لیے کوئی منفی خیال نہ آیا تھا جبکہ عامر بھائی او رفرزانہ کے بازو علی نواز کی آخری بات سن کر ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

''انسان فرشتہ نہیں ہوتا عامر بھائی! میں نے آپ

کے ہاں رشتہ یہ دیکھ کر کیا تھا کہ مجھے اچھائیاں زیادہ لگی تھیں بہ نسبت کمزور پہلو کے، مگر بہت افسوس ہے کہ ہم نے ایک اور تعلق کے اضافہ کا فیصلہ قطعاً درست نہ کیا۔ اور ہاں رشتہ ختم کرنے کے فیصلہ میں میری بیٹی کا قطعاً کوئی مطالبہ شامل نہیں، اور نہ اس نے ہمیں جذباتی دباؤ میں لانے کی کوئی کوشش کی ہے۔ یہ ہمارا اپنا ذاتی فیصلہ ہے۔'' علی نواز کے لہجہ میں سختی آ گئی تھی، انھوں نے کمرے سے باہر قدم بڑھا دیے۔

میمونہ نے پریشان نظروں سے بہن کو دیکھا جن کے چہرے پر انتہائی بیگانگی تھی۔ بہن کے تاثرات نے جیسے میمونہ کی توانائی بالکل ہی نچوڑ دی۔ وہ بھاری قدموں سے میاں کے پیچھے چلی گئیں۔ گھر پہنچنے تک علی نواز کے انداز اس قدر پتھریلے تھے کہ میمونہ کے لیے کوئی لفظ زبان سے نکالنا بھی ناممکن تھا۔

گھر پہنچتے ہی جیسے ان میں تبدیلی یکدم آ گئی۔

''میمونہ جو کچھ تم نے آج جانا اس کو نہ جاننا تمھارے لیے بہتر تھا۔ میں نے اس لیے کبھی تم سے ذکر ہی نہ کیا کہ غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ اور اگر یہ غلطی ہماری اولاد سے ہوتی تو ہم بھی یہ ہی چاہتے کہ اس پر اتنا دبیز پردہ پڑے کہ اس کی جھلک تک کوئی نہ پا سکے۔ اور اگر ہم ماں باپ کے علاوہ بن کر سوچیں تو طلعت کی منگنی اس طرح ختم کرنے کا بہرحال جواز نہیں بنتا۔ لیکن منگنی یا شادی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کو دوسرا کوئی پسند آ ہی نہیں سکتا۔ مخلوط اداروں سے یہ ہی فساد جنم لیتا ہے۔ یہ ہم انسانوں کی حماقت ہے کہ آگ سے کھیلنا چاہتے ہیں اور دامن بھی بچا رہے، اس کی بھی تمنا رکھتے ہیں۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا۔ ہماری بیٹی ہمارے فیصلے پر قربان ہو جاتی خاموشی سے یہ مجھے منظور نہ تھا اور پھر عثمان کی بات اور عامر بھائی کے لیے ان کے تاثرات کے بعد تو قطعاً مہر لگ گئی ہے کہ ہم طلعت کا رشتہ عباس سے ختم کر چکے ہیں۔ میں بددعاؤں کی ان دیکھی گردش میں اپنی بیٹی کیا اپنی کسی بھی اولاد کو لانا نہیں چاہتا۔''

میاں کے جملے میمونہ کو سن کر رہے تھے علی نواز مرد تھے، انھوں نے حوصلے اور تجزیہ سے فوری فیصلہ کر کے قدم اٹھا لیا تھا۔ جبکہ میمونہ لاشعوری طور پر بیٹی کی خوشی کی خاطر یہ سب چاہتے ہوئے بھی اب جیسے ڈھے رہی تھیں۔ علی نواز نے گہری نظروں سے بیوی کے ستے چہرے کو دیکھا اور اپنے سیل فون سے کال ملانے لگے۔

بعض حقائق کا ایک دم سے علم ہونا انسان کو عرصہ کے لیے سوگوار کر دیتا ہے۔ میمونہ کے لیے بھی عامر بھائی، عثمان بھائی اور علی نواز کی تکون نے خاصی حد تک تکان وجود میں بھر دی تھی۔ بہن نے بھی سرد مہری اپنا لی تھی۔ جبکہ عثمان بھائی تو جیسے خوشی سے نہال ہو چکے تھے۔ طلعت کی آنکھوں میں بھی جوت جل اٹھی تھی۔ زندگی کس قدر حسین ہے۔ ایسا طلعت کو اس جملے کی بازگشت سے کئی دنوں تک لگا جو ڈیڈی نے اسکائپ پر اس سے بات کرتے کہا تھا۔

''ہم نے تمھارا اور عباس کا رشتہ ختم کر دیا ہے۔''

عباس پر کیا بیتی اسے اس سے اب کوئی غرض نہ تھی کیونکہ یہ رشتہ اس کے ماں باپ نے ختم کیا تھا جن سے رشتہ ختم کرنے کا مطالبہ اس نے نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس نے اپنے دل کی خواہش کو زبان چاہے نہ دی لیکن ماں باپ اور اولاد کا رشتہ خالق کائنات نے کچھ ایسا بنایا ہے کہ وہ بچوں کی آرزوئیں، تمنائیں، خواہشات بن کہے جان جاتے ہیں۔ ان کے خوف ان کے ڈر وہ ان کے بغیر بتائے سمجھ جاتے ہیں۔ اور جب کبھی ایسا نہیں کر پاتے تو دراصل وہ اپنی ذات کے مسائل میں اس قدر الجھے ہوتے ہیں کہ دوسرے انسان کو سمجھنا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ زندگی کے نشیب و فراز، حالات و واقعات ان سے اولاد کی محبت تو بے شک نہیں چھین پاتے لیکن ان کو سمجھنا ان کے لیے گھمبیر ہو چکا ہوتا ہے۔

طلعت کے والدین نے بھی اس کے دل کی کیفیت کا ابھرتا عکس محض اس کی پھیکی مسکراہٹ سے جان لیا تھا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کی بیٹی ان کی عزت و وقار پر قربان ہونے کو تیار ہو جائے گی لیکن یہ بلی ان کو درکار نہ تھی۔ وہ تو اپنے بچوں کو خوش و خرم دیکھنا چاہتے تھے، ایک دائرے کو پھلانگ کر دوسرے میں جانے کے لیے اگر انھیں کچھ سہنا بھی پڑتا تو وہ یعنی علی نواز اس کے لیے تیار تھے اور پھر انھوں نے یہ ہی کیا۔ وہ تو پھر قدرتی عوامل بھی ان کی اس خواہش میں معاون بنتے چلے گئے۔ اخلاقی قدروں کی پامالی نے بھی فیصلہ کرنا جیسے آسان کر دیا۔

عثمان ملک کے دل کی تڑپ نے ایسا اثر دکھایا کہ عباس سے ناطہ ٹوٹ ہی گیا اور طلعت کے اردگرد تتلیاں اپنے خوبصورت اور دلکش پر ہلانے لگیں۔ کلون کی فضاؤں میں جیسے دھنک ٹھہر سی گئی تھی اور ماریو کی آنکھوں کی پتلیوں پر طلعت علی کا عکس دوبارہ سے جھلملانے لگا تھا۔ لیکن طلعت کے ساتھ جو پیچیدہ واقعات ماریو کے ساتھ وابستگی کے بعد سے پیش آ رہے تھے وہ بدستور جاری تھے۔ امرتا نے لگتا تھا کہ تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ طلعت کو ماریو سے ہر صورت علیحدہ کر کے رہے گی۔ جہاں خوشیوں کی دھنک سی طلعت کو محسوس ہوتی وہاں ان تجربات نے بھی اس کو سہما دیا تھا۔ ایک سلسلہ تھا جو ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ راتیں اس طرح عجیب عجیب مناظر سے بھرپور ہوتیں۔ یہ تو الہامی دعائیں تھیں جو طلعت کو یہ سب سہنا ممکن بنا دیتی ورنہ وہ شاید ہی جی پاتی۔ ماریو کے ساتھ کے تصور نے اس کے وجود میں جیسے روشنیاں سی بھر دی تھیں۔ عثمان ملک اور ان کی بیوی بھی بے حد مسرور تھے۔ مامی کی بیماری راتوں رات دھیمی ہو گئی اور عثمان ملک کی آنکھوں میں تیرتا انتظار مٹ چکا تھا۔ لگتا تھا طلعت اور ماریو کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے کی امید نے ان دونوں کو گھن کی طرح اندر سے کھاتے غموں سے آزاد کر دیا ہے۔

ان کی بظاہر اوپر سے شاندار عمارتیں جو اندر سے بھربھری ہو رہی تھیں وہ جیسے نئے سرے سے مرمت ہو چکی تھیں۔ بس ایک طلعت تھی جو خوشی کے ساتھ ساتھ

امرتا کے حملے بھی سہہ رہی تھی۔

''میرا یقین ہے طلعت یہ سب پریشانیاں جو تم سہہ رہی ہو ماریو کے ساتھ شادی ہوتے ہی ختم ہو جائیں گی۔ ابھی تم لوگ جو ملتے ہو وہ زمین اور آسمان اور اس کے درمیان کے لیے بنائے گئے اصولوں سے متصادم عمل ہے۔ ہم جب اس نظام میں خلل ڈالتے ہیں تب دعائیں بھی وہ اثر نہیں دکھاتیں کیونکہ ہمارا عمل کچھ نہ کچھ بگاڑ پیدا کر رہا ہوتا ہے۔''

ماریہ ملک نے ایک روز اسے گم صم سا بیٹھا دیکھ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو وہ ایسے چونک اٹھی جیسے کہیں بہت دور سے لوٹ کر آئی ہو۔ اس وقت اس کا چمکتا چہرہ زرد سا ہو رہا تھا۔

گزشتہ رات اس کا بستر خون نما دھبوں سے بھر گیا تھا۔ کل ہی ماریو نے اس کو اس کی سالگرہ پر بریسلٹ تحفہ میں دیا تھا۔ وہ اس کو بھرپور طور پر انجوائے کرنا چاہتی تھی لیکن ہمیشہ کی طرح اب بھی ماریو کے حوالے سے امرتا اپنے وار چلا رہی تھی۔ ماریہ ملک کی باتیں سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی، واقعی اس پہلو سے تو اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ کیوں دعائیں بے اثر ہو رہی ہیں۔ ماریو کے ساتھ بندھن کے تصور نے ہی اس میں توانائی کی لہریں رواں کر دی تھیں۔ ماریہ نے مسکرا کر طلعت کو دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

''مجھے امید ہے کہ عثمان کی بھانجی اور میرا بھانجا نظام کائنات سے متصادم عمل سے ممکن حد تک گریز کرتے ہوئے بہت ہی خوشگوار اور سلامتی والا خاندان بنائیں گے۔''

''ان شاءاللہ! ان شاءاللہ!'' مردانہ آواز میں شوخی نمایاں تھی، دونوں نے چونک کر دیکھا عثمان ملک اور ماریو دونوں ہی موجود تھے۔ طلعت کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔

اس کے پاس ڈھیروں بلبلے نرمی سے جیسے اڑتے اس سے ٹکرانے لگے تھے۔ خوشی کی اسی کیفیت کو محسوس کرتے اس نے اللہ سے ہدایت اور سلامتی کی دعائیں بھی دل میں ابھرتی محسوس کیں۔ ''ایک سرپرائزنگ خبر یہ ہے کہ ہم اس ہفتہ ہی ماریو سمیت پاکستان جا رہے ہیں۔ طلعت کی شادی وہیں ہوگی۔'' عثمان ملک کی خبر نے اردگرد جیسے خوشبو اور روشنی بھر دی تھی۔ ماریو نے نظر اٹھا کر ان کو دیکھا اور پھر کھڑکی سے نظر آتی اس منی سی نیلی چڑیا کو جو ایسے پھدک رہی تھی جیسے مبارک باد دے رہی ہو۔

(ختم شد)

ڈش در ڈش سے ون ڈش تک

انسان اپنے عاقل ہونے کا کتنا ہی دعویٰ کرے حقیقت یہ ہے کہ اکثر اوقات وہ اس دعوے کی نفی کرتا نظر آتا ہے، شاید اسی لیے قرآن میں اسے ظلومًا جہولا (ظالم اور جاہل) کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔..... اب یہی دیکھ لیجیے کہ اسے اچھا بھلا پاک اور سادہ کھانا کھانے کو کہا گیا ہے (شکم سیری سے منع کیا گیا ہے.....) مگر کیا ہے کہ اسے گھر کا پکا ہوا کھانا پسند نہیں آتا۔ جیب میں کچھ دھیلے ہوں تو ریسٹورنٹ اور ہوٹل کا رخ کرتا ہے۔ لب سڑک ٹھیلوں سے اناپ شناپ چیزیں لے کر کھاتا ہے، مردہ مرغیوں کا سوپ چسکیاں لے کر پیتا ہے اور برڈ فلو سے متاثرہ مرغی کے کباب اور بریانی مزے لے کر کھاتا ہے، چھچھڑوں پر باسی پراٹھا لپیٹ کر کباب رول کے نام پر کھا جاتا ہے۔ سڑے ہوئے ٹماٹروں کا کیچپ باسی برگر کے ساتھ ذوق وشوق سے تناول کرتا ہے۔ آلودہ اور مضر صحت شکنجبین اور کولڈ ڈرنک پیتا ہے۔ منرل واٹر کے نام پر دھوکا کھاتا ہے (بلکہ دھوکا پیتا ہے!) اور اگر چشم بد دوران علتوں سے بوجہ عقل سلیم یا بوجہ تنگی داماں پرہیز کرتا بھی ہے تو تیار شدہ مصالحوں کے ڈبے تو بہر حال گھر لاتا ہی ہے کہ بیگم یا بیٹی کھانا خوش ذائقہ یا خوش رنگ بنا سکیں (تاکہ کھانے کی اشتہا اور معدے کا مرض بڑھے..... اور ڈاکٹروں کی رزق روزی کا کاروبار پھل پھول سکے)۔

ہر چند کہ ''کھانا'' کھانا انسان کی بنیادی ضرورت ہے، زندانِ حیات میں آنکھ کھولتے ہی بچہ بلبلا کے روتا ہے (کہ مولا! یہ کہاں بھیج دیا!!) اور نانی اماں اسی بلبلاہٹ کو بھوک سے تعبیر کرتے ہوئے جھٹ اسے شہد کی گھٹی چٹا دیتی ہیں (تاکہ بچہ ذائقہ شناس ہو جائے) بس یہیں سے آدمی کے دنیا میں آنے کا اولین و آخرین مقصد اس پاپی پیٹ کی آبیاری و نشوونما قرار دے دیا جاتا ہے۔ آدمی جیتے جی تو جیتے جی مر کے بھی دوسروں کو کھلا جاتا ہے۔ (شاید اس وقت بھی اس کی روح دسترخوان پر موجود ہو اور گھورتی ہو ان لوگوں کو جنھوں نے ساری عمر اسے کھلایا، جن کے کھانے اور پہننے کی فکر نے اسے کھایا، جن کی خاطر اس نے قرض ادھار کھایا، جن کی خاطر اس نے ضمیر کو بیچ کھایا .....) خیر ..... ہم کہہ رہے تھے کہ کھانا ہی وہ ستون ہے جس کے اوپر ہمارے جسم کی عمارت کھڑی ہے .....سو کوئی بھی ''ایونٹ'' ہو..... ''ویک اینڈ'' ہو

.....سالگرہ ہو، برسی ہو، منگنی ہو، مایوں ہو، کوئی پاس ہوا ہو، کسی نے گھر لیا ہو، کوئی پیدا ہوا ہو، کسی نے حج کیا ہو، کوئی لڑکی دیکھنے آ رہا ہو، کسی کی شادی کی تاریخ رکھی گئی ہو.....کوئی باہر سے آیا ہو، کسی کی ترقی ہوئی ہو..... ہر ہر موقعے پر کھانا اور کھانے کا انتظام کرنا از بس ضروری ہوتا ہے.....کبھی رسم ورواج کے نام پر.....کبھی تقریب کچھ تو بہر ملاقات کے بہانے .....کبھی طعنے سے بچنے کے لیے.....کبھی اخباروں میں چھپنے کے لیے.....کبھی مہمان نوازی کی داد پانے کے لیے .....کبھی خوش اخلاقی کا سکہ جمانے کے لیے .....کبھی جیب کی گرمی دکھانے کے لیے.....کھانا کھلانا اور کھلانے کی ترغیب دینا ہمارا شیوہ ہے.....دیگر مواقع پر تو آپ لوگوں کو جو کچھ کھلاتے ہیں وہ اتنا قابل ذکر اور قابل دید نہیں ہوتا .....(ہر چند کہ لوگ سوئم، چالیسویں کے کھانے میں بھی بوٹی کی کمی کا گلہ کر جاتے ہیں) مگر ''شادی'' جیسے اہم مواقع پر کھانے کی اہمیت کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے (کیونکہ محفل رنگ ونور سجائی ہی کھانے کے لیے جاتی ہے) آپ چاہے اپنی بیٹی کو کروڑوں کا جہیز دیں مہمانوں کو اس سے کیا، مہمانوں کو تو کھانے سے مطلب ہے۔

کھانا من پسند ہو تو اس شادی کو مدتوں یاد رکھا جاتا ہے (اور مدتوں ایسی ہی کسی شادی کا انتظار کیا جاتا ہے) اب اگر آپ بے جا اخراجات سے بچنے، قرض میں پھنسنے اور دل پکڑ کر بیٹھنے کے بجائے کھانے میں ''ون ڈش'' کا انتظام کرتے ہیں تو آپ کی بیگم، بچے خجالت میں مبتلا رہتے ہیں، مہمانوں سے آنکھیں چرائے رہتے ہیں۔''اور لیجیے.....دیکھئے تکلف نہ کیجیے گا !! .....کوئی ڈش منگوا دوں ؟؟..... جیسے میزبانی کلمات بھی ان کے منہ سے ادا نہیں ہوتے (بعد از شادی آپ کی کلاس بھی لی جاتی ہے کہ آپ بھی حد کرتے ہیں، ناک کٹوا کے رکھ دی)

چنانچہ شادی کی تقریبات پر انواع واقسام کے کھانوں کا اہتمام کرنا اب لازمی قرار پا چکا ہے۔ کھانے کے مد میں بے جا اخراجات کو اب اخراجات نہیں ضرورت کہا جاتا ہے۔ بھئی اتنی مہنگائی ہے کہ سفید پوش افراد تکہ بوٹی، شیر مال، تافتان، کلیجے، کچوریاں، بریاں مچھلی، سیخ کباب، سفید قورمہ، بروسٹ، چکن بریانی، چائنیز رائس، دہی بڑے، سلاد، سموسے، آئس کریم، کولڈ ڈرنک، دودھ دلاری، چم چم، رس گلے وغیرہ وغیرہ سے بیک وقت اپنے دسترخوان کو سجانے کے نہ متحمل ہو سکتے ہیں نہ اس کے خواب دیکھ سکتے ہیں .....ڈش در ڈش.....آئٹم در آئٹم.....آئی جوان کی یاد تو آتی چلی گئی کے مصداق ایک ڈش کے بعد دوسری ڈش آتی چلی جاتی ہے..... پلیٹ میں ڈھیر لگتا جاتا ہے .....ڈھیر بلند ہوتا جاتا ہے.....شکم سیری سے معدہ آہ آہ! کر اٹھتا ہے.....(مگر ہاتھ ہے کہ رکابی سے نہیں

اٹھتا ہے) اس اہتمام طعام سے ہماری بسیار خوری ، خوش خوراکی ، ہوس طعام اور صفت شکم سیری کو بڑی تقویت ملتی ہے .....متمول افراد اپنے یہاں کی شادی میں اس سے اچھے کھانا کا اہتمام کرنے کا ارادہ کر کے اٹھتے ہیں .....اور وہ لوگ !! .....جن کی تنخواہیں دال روٹی کے لیے بھی ناکافی ہوا کرتی ہیں وہ.....کھانے کا اہتمام و انتظام کرنے کا سوچ کر بھی ہسپتال جا پہنچتے ہیں۔کسی کو انجائنا پین ہو جاتا ہے، کسی کی دھڑکن بے ترتیب ہو جاتی ہے، کسی کا فشارِ خون کے ٹوکی چوٹی سر کر لیتا ہے، کوئی بے خوابی کا شکار ہو جاتا ہے، کوئی ڈپریشن میں چلا جاتا ہے .....ایسے تمام افراد کو رسوائی ، قرض، طعنوں اور شرمندگی وغیرہ سے محفوظ رکھنے کے لیے سرکار نے شادی کی تقریب میں ''ون ڈش'' کی منظوری دے دی ہے ..... جو ایک خوش آئند اقدام ہے ..... (ایک مقروض قوم کو زیب نہیں دیتا کہ وہ کسی بھی موقعے پر اسرافِ بے جا کا مظاہرہ کرے) دیکھنا یہ ہے کہ عوامی حلقوں میں اس قانون کو کتنی پذیرائی ملتی ہے اور قانون شکنی کرنے والوں سے کس حد تک سختی برتی جاتی ہے، کہ قانون شکنی میں بھی ہمارا جواب نہیں۔

بل تو اس سے پہلے بھی منظور ہوتے رہے ہیں مثلاً خواتین کو ہراساں کرنا، چھیڑنا، تشدد کرنا، ان پر تیزاب پھینکنا، ان سے زیادتی کرنا قابل سزا جرم قرار دیا جا چکا ہے لیکن لاتوں کے بھوت باتوں سے کہاں بھاگتے ہیں ! جرائم کو مزاج، روایت اور عادت بنا لیا جائے تو.....کیا کرے گا قاضی !!

☆☆☆

چلتے ہوتو.....

سفرنامے پڑھنے سے یہ آسانی ہو جاتی ہے کہ آپ گھر بیٹھے سستے ترین طریقے سے دنیا کے کسی بھی حصے کی سیر کر سکتے ہیں گویا ''ہینگ لگے نہ پھٹکڑی رنگ بھی چوکھا آئے'' ضرور سفرنامے لکھنے کی ابتدا کسی انتہائی کنجوس شخص بلکہ قرین قیاس ہے کہ کسی شوہر نے کی ہوگی کہ جب بیچاری بیوی نے گھومنے کی فرمائش کی ہو گی تو لے کر سیر کے مقام کا چپہ چپہ بمعہ خوبیوں اور خامیوں کے بیان کر دیا ہوگا لیجیے ہوگیا کام بیگم بھی خوش خرچا بھی بچا۔

ان ہی سفرناموں کا مطالعہ کرتے کرتے ہم کو بھی شوق چڑھا کہ ایک سفرنامہ لکھ ہی ڈالیں تا کہ اگر کسی کا کراچی آنے اور گھومنے کو دل چاہے اور اس کی جیب اور ہمت اجازت نہ دے تو وہ اس سفرنامے سے اپنا دل بہلا لے۔

جی ہاں یہ کراچی ہے۔ روشنیوں کا شہر..... روشنی ٹائروں اور گاڑیاں جلنے سے بھی ہوتی ہے اور عمارتیں اور فیکٹریاں جلنے سے بھی۔ سو یہ شہر ہمہ وقت روشن رہتا ہے۔ یہاں پر برقی قمقموں کا جدید ورژن گولیوں اور کریکرز کی چمک ''دھمک'' سے علاقہ بہ علاقہ سجا ہوا ہے .....مشہور تھا بلکہ ہے کہ یہ شہر کبھی نہیں سوتا..... جی ہاں ایسا ہی ہے۔ زندگی اتنی بے اعتبار ہوگئی ہے کہ ہر کوئی جاگ کر چین کے پل گنتا ہے کہ جتنے پل خیر سے گزر گئے غنیمت ہیں۔ یہ ایک پرامن شہر ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ امن کی تعریف یہاں پر ''ایک لاش سے دوسری لاش گرنے کا'' وقفہ'' ہے۔ مگر پھر بھی یہاں کی مارکیٹیں آباد ہیں۔ مالدار طبقہ زیادہ سے زیادہ خریداری کرتا ہے تا کہ دکان دار آسانی سے بھتہ دے کر اپنی جان اور دکان دونوں کو بچا سکے۔

اگر آپ سڑکوں پر نکلتے ہیں تو آپ کو ہر جگہ گاڑیوں کی لمبی قطاریں نظر آئیں گی جو اگر مبالغہ نہ ہو تو چاند سے دیوارِ چین کی طرح ضرور دکھتی ہوں گی۔ ان کو دیکھ کر آپ پریشان بالکل مت ہو جایئے گا یہ کراچی کے عوام کا نیا نیا مشغلہ ہے جس میں وہ خوب مصروف عمل ہیں۔ یہ دراصل CNG بھروانے کے انتظار میں کھڑی گاڑیاں ہیں جو CNG بھروانے کی قطار میں لگ کر اپنا پٹرول جلاتی ہیں اور CNG بھر جائے تو پٹرول بھروالیا جاتا ہے اور اس کے بیچ کراچی کے عوام اپنے روزمرہ زندگی کے کام بھی نمٹا دیتے ہیں۔

کراچی کے عوام انتہائی زندہ دل اور پر جوش ہیں وہ ہر طرح کے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ یہاں پر ہفتہ کا کوئی بھی ایک دن انتہائی خراب حالات کے لیے مختص ہے خیال رہے ''انتہائی'' ورنہ ہمارے ریاستی بہی خواہوں کے بقول ۱۰ سے ۱۲ افراد کا قتل اور ۲۰، ۲۵ موبائل و موٹر سائیکل کا چوری ہو جانا تو معمول کی بات ہے۔

جی تو بات ہو رہی تھی کہ ہفتہ کے ایک دن کی چھٹی کی جو کسی نہ کسی پارٹی کی طرف سے عوام کو ایک ''پارٹی ڈے'' کے طور پر دی جاتی ہے کہ وہ گھر بیٹھ کر پارٹی انجوائے کریں خواہ گھر میں کھانے کو بھوسی کا ٹکڑا تک نہ ہو..... ہاں مگر کھانے کا بھی انتظام ہے باہر نکلو اور گولی کھالو.....

ان باتوں سے قطع نظر یہاں پر تفریح گاہیں بھی ہیں اور چڑیا گھر و سفاری پارک بھی جہاں پر بیش قیمت جانور لائے جاتے ہیں مگر ان کا کھانا ..... ماتحت عملے کے گھر چلے جانے کے باعث ان کی موت کا سبب بنتا ہے لہٰذا عوام کو دو دفعہ نئے اضافے کا معلوم ہوتا ہے۔

ایک تیرے آنے سے پہلے ایک تیرے جانے کے بعد

یہاں پر آنے کے تین طریقے ہیں ٹرین، ایئرپورٹ اور سڑک کا راستہ۔ ہے تو بندرگاہ بھی مگر وہ نیٹو کی مدد میں مشغول ہے۔ جہاز سے آنے میں آپ کو سیکورٹی گارڈز کی طرح سے ایک خاص محافظوں کا ٹولہ گھیر لے گا اور آپ کے سامان کو کم سے کم کرنے میں آپ کی مدد اور جیب کے وزن میں کمی کرنے میں معاون ثابت ہوگا یہاں مزاحمت کا مطلب بس ایک گولی اور پھر سکون قلب تو ذرا اپنے جذبات عیاں کرنے میں محتاط رہیں.....

ٹرین اگر وقت پر آ گئی تو آپ خوش قسمت لوگوں میں شمار کر لیے جائیں گے بس سے آنا بھی ایک ذریعہ ہے مگر بس اسٹینڈ زیادہ تر شہر کے انتہائی کونوں میں واقع ہیں تو جہاز و ٹرین کی طرح اس میں بھی کچھ مشکلات ہو سکتی ہیں۔

بس پھر آپ کو شہر کراچی خوش آمدید کہتا ہے..... اور مزید یہ بھی کہتا ہے۔

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

☆☆☆

آسیہ راشد

میری امی

آپا ارشاد بتول کی یادیں

ارشاد بتول تمام خاندان کی آپا تھیں مگر صرف میری امی تھیں۔ آج ان کے بارے میں لکھتے ہوئے میرے دل میں ایک گونہ اطمینان کا احساس بھی ہے کہ میں آج اگر کچھ لکھنے کے قابل ہوں تو اللہ کی توفیق کے بعد ان کی وجہ سے ہوں ساتھ ہی دکھ کا احساس بھی شامل ہے کہ وہ آج ہم میں موجود نہیں وہ یقیناً افق کے پار ستاروں کی بستی میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ہمراہ خوش گپیوں میں مصروف ہونگی اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)۔

میری امی کا شمار ان عظیم ماؤں میں ہوتا ہے جو محبت و شفقت کے ساتھ ساتھ صبر، شکر اور عفو و درگزر کا روشن مینار ہوتی ہیں اور جن کا وجود ایک ادارے کی مانند ہوتا ہے ان کی والدہ میری نانی جان حبیب النساء نے خرابیٔ صحت کی وجہ سے گھر کی تمام ذمہ داری انھیں سونپ رکھی تھی۔ انھوں نے والدین کے گھر پر بلا شرکتِ غیر حکومت کی مگر نہایت عاجزی سے انھوں نے ایک گمنام سپاہی کی طرح اپنے فرائض انجام دیے جسے کسی صلے یا انعام کی تمنا نہیں ہوتی صرف اور صرف اپنے کام سے لگن ہوتی ہے۔ انھوں نے ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح زندگی گزاری جس نے اردگرد والوں کو معطر رکھا اور ٹھنڈک اور فرحت بخشی مگر خود کہیں بھی دکھائی نہ دیں۔

امی تو سیدھے سبھاؤ والی عام سی خاتون تھیں انھیں جان محفل بننا نہیں آتا تھا وہ تو محفلوں کو سجانے والوں کی خدمت کے لئے مامور کر دی گئی تھیں۔ میں نے انھیں کبھی شوخ و شنگ کپڑے اعلیٰ جیولری، ہیل والا جوتا عمدہ پرس لیے اور نہ ہی کبھی میک اپ کیے ہوئے دیکھا تھا نہ ہی وہ کسی بھی محفل میں مہمانِ خصوصی کے طور پر دکھائی دیں۔ ہاں البتہ یہ ضرور تھا کہ کپڑوں کے معاملے میں ان کی پسند بہت عمدہ تھی۔ کپڑے سادہ مگر قیمتی ہوتے۔ ایک ہاتھ میں تین سونے کی چوڑیاں مدت سے پہنے ہوئے تھیں جن کا ڈیزائن بدلوانے کی انھوں نے کبھی کوشش نہ کی تھی۔

وہ عمدہ سے عمدہ کھانا پکا کر میز پر رکھ کر یوں منظر سے ہٹ جاتیں کہ کوئی جان نہ لے کہ عمدہ کھانے کس نے بنائے ہیں، سبھی فرمائشیں کرتے اپنی اپنی پسند انھیں بتا کر بے فکر ہو جاتے۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔۔۔ صرف بے لوث خدمت ہی ان کا شعار رہا۔

گھر کے تمام افراد کو وقت پر ہر شے مہیا کرنا گھر کی صفائی ستھرائی، کھانا پکانا، بازار سے کپڑوں کی خریداری، بھائی بہنوں کی شادیاں، سبھی ان کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ بلاشبہ وہ بہترین منتظم تھیں۔

کھانے کے معاملے میں انھوں نے اپنے لیے انوکھا

ہی دستور اپنایا ہوا تھا۔ اپنے لیے بہت اچھے کی خواہش کبھی نہ کی۔ جو ملا کھا لیا بتایا کرتی تھیں ان کے سسرال والے زمیندار لوگ تھے وہ اکثر نمک مرچ کے ساتھ روٹی کھا لیتے تھے اس لیے مجھے بھی مشکل نہیں لگتا میں بھی نمک مرچ کے ساتھ بہت سہولت سے روٹی کھا لیتی ہوں۔ وہ آم، خربوزہ، امرود کی چاٹ کے ساتھ بھی بہت شوق سے روٹی کھا لیتی تھیں۔

جماعت اسلامی کی خاموش کارکن تھیں۔ جب کبھی الیکشن آتے تو گھر میں آنے والے ہر شخص کو پرزور طریقے سے جماعت اسلامی کو ووٹ دینے کے لئے قائل کرتیں۔ جماعتی سرگرمیوں سے پوری طرح باخبر رہتیں۔ دین کے کام کرنے والوں سے دلی محبت رکھتیں۔ اپنی بہن رخشندہ کوکب کی سہیلیوں کا ذکر بہت محبت اور احترام سے کرتیں خصوصاً بنت الاسلام صاحبہ، زہرہ وحید صاحبہ ثریا اسماء صاحبہ کا سب سے زیادہ ذکر میں نے ان سے سنا۔ سوشل کاموں کے سلسلے میں خالہ جان زہرہ وحید صاحبہ جب مجھے پہلی بار اپنے ساتھ لے کر چلیں تو ان کا نام سن کر مجھے فوراً امی سے اجازت مل گئی تو ''تم زہرہ کے ساتھ جا رہی ہو اس لیے مجھے بے فکری ہے''۔

اتنے زیادہ کاموں کے ساتھ میں نے انھیں باقاعدگی سے اخبار اور کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے دیکھا ہے۔ صبح سویرے سب کے جاگنے سے پہلے وہ اخبار پڑھ چکی ہوتیں۔ ملکی و غیر ملکی حالات سے پوری طرح باخبر رہتیں۔ پہلے ریڈیو پھر ٹی وی پر نو بجے کی خبریں ضرور سنتیں۔ رات جب سو رہے ہوتے تو میں نے انھیں کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتے دیکھا ہے۔ میں نے اپنی والدہ رخشندہ کوکب پر جو کتاب مرتب کی اس کی راوی امی تھیں۔ قرآن کی کہانیاں، الف لیلیٰ کی داستانیں نبیوں کے قصے میں نے بچپن میں ہی امی سے سن لیے تھے۔

پنج وقتہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، تہجد جیسے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ معاملات میں میں نے انھیں بہت محتاط پایا۔ ہر کسی سے صلح، صفائی کسی کا برا نہ چاہنا، خلوص دل سے ہر ایک کے کام آنا انہی پر ختم تھا۔ ان کا خدمت و ایثار کا رویہ صرف گھر والوں تک محدود نہ تھا بلکہ پورا خاندان ان کے احسانات کا مرہون منت رہا۔ جس کسی کے گھر میں شادی بیاہ کا معاملہ ہوتا یا زچگی کی مصروفیات یا کوئی اور معاملہ آپا ارشاد کو یاد کیا جاتا ان سے مشورے لیے جاتے ان سے مدد چاہی جاتی وہ سب کی امیدوں پر پورا اترتیں۔ میں اکثر ان کے بارے میں سوچتی کہ اگر انھیں تعلیم حاصل کرنے کے بہترین مواقع ملے ہوتے اور گھر کا ماحول انھیں باہر کام کرنے کی اجازت دیتا تو یقیناً معاشرے میں ان کا نمایاں مقام ہوتا۔

انھوں نے اپنے گھر کے قریب ایک سلائی سکول کی بھی بنیاد رکھی۔ جس میں بہت سی لڑکیاں ان سے سلائی سیکھنے آتیں، کپڑوں کی سلائی، مشینی کڑھائی، نٹنگ میں وہ بے حد ماہر تھیں۔ بچوں کے فراک، نیکر، شرٹ، لیڈیز و مردانہ سوٹ کے علاوہ مردانہ پینٹ کوٹ بھی بہت عمدہ سی لیتی تھیں۔ انھوں نے مشینی کڑھائی سے اتنی عمدہ اشیاء تیار

کیں کہ انھیں اگر آج کسی نمائش کا حصہ بنا دیا جائے تو یقیناً اول انعام کی حقدار پائیں۔ یوں تو ان کی تیار کردہ تمام اشیاء ہی قابل دید ہیں مگر ایک سینری کا ذکر میں خصوصا کروں گی جسے ڈرائنگ روم کی سینٹر ٹیبل کے شیشے میں جڑوایا گیا جس سے میز کا حسن دوبالا ہو گیا وہ میزیں ان کی چھوٹی بہن مسرت افزاء کی شادی کے موقع پر ان کے جہیز میں دی گئیں۔ اپنے بھائی مظہر قیوم کی شادی کا عروسی جوڑا خود ڈیزائن کر کے دیا۔ سنہری رنگ پر سنہری باریک تلے دبکے باریک کناری اور موتیوں کا کام عجب بہار دکھلا رہا تھا ایسا عمدہ جوڑا تیار ہوا کہ دیکھنے والے ہاتھ لگا لگا کر دیکھتے کہ یہ جوڑا کہاں سے تیار کروایا۔ پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ان کی بھابھی نے وہ جوڑا سنبھال کر رکھا ہے اور اس کی چمک دمک آج بھی اسی طرح برقرار ہے۔

وہ نہ صرف گھر کے ہر محاذ پر کامیاب و کامران رہیں بلکہ قیام پاکستان کے وقت انھوں نے ہر ممکن حد تک کام کیا۔ جن دنوں پاکستان بنا ان کے والد میاں نجم الدین صاحب کی پوسٹنگ شیخوپورہ میں تھی۔ مسلم لیگ نے اعلان کیا کہ تمام مسلمان گھرانے مسلم لیگ کے جھنڈے اپنے گھروں پر لگائیں تا کہ اندازہ ہو سکے کہ یہاں کتنے مسلمان گھرانے آباد ہیں اور مسلمانوں کی قوت کا اظہار ہو۔ امی نے اپنی کالونی کے تمام گھروں کے لئے پرچم سیئے۔ دو تین دن لگا کر پرچم تیار ہو گئے۔ اگلے روز تمام کالونی کے مسلم گھرانوں پر ان کے ہاتھ کے سلے ہوئے پرچم لہرا رہے تھے۔

شیخوپورہ کلب میں جا کر مختلف سرگرمیوں میں حصہ لینا، خواتین کو جمع کر کے درس سننے کے لئے تیار کرنا انہی کا کام تھا۔ درس دینے کا سلسلہ ان کی بہن رخشندہ کوکب نے شروع کیا۔

پارٹیشن کے بعد جب تمام مہاجرین لٹی پٹی حالت میں پاکستان پہنچ رہے تھے اس وقت انھیں کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ ساتھ کپڑوں کی بھی بے حد ضرورت تھی۔ ان کے والد صاحب انھیں کپڑوں کے تھان لا کر دیتے کہ مہاجرین کے لئے لباس تیار کر دیں۔ ان کی چھوٹی بہنیں منور سلطانہ (رخشندہ کوکب) اور نسیم اختر کپڑوں کی کٹنگ کر دیتیں اور امی تمام رات بیٹھ کر کپڑے سیتی رہتیں تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی بروقت ضرورت پوری ہو سکے۔

میری امی رخشندہ کوکب کی وفات کے بعد جب انھیں میری ذمہ داری اٹھانی پڑی تو انھوں نے بقایا کاموں کی طرح اپنی پوری توجہ مجھ پر مرکوز کر دی۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو ایک بے حد مشفق اور محبت کرنے والی ہستی کو ہر دم اپنے پاس موجود پایا جو سائے کی طرح ہر آن میرے پاس ہوتیں، میری ہر ضرورت کو بھاگ بھاگ کر پورا کرتیں۔

مجھے اپنی کوئی خواہش یاد نہیں جو میں نے کی ہو اور وہ پوری نہ ہوئی ہو مگر ان کی محبت و شفقت میں ہمیشہ ایک خط کھینچا ہوتا جو میری بے جا ضدوں کو نہ ماننے والا خط تھا

جس کو پار کرنے کی کوئی گنجائش موجود نہ تھی اور وہ خط تھا حدود کا۔صرف جائز خواہشات پوری کی جاتیں۔ جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نا فرمانی شامل ہوتی ادھر سے صاف انکار مل جاتا۔

جب میں اپنے ماضی پر نگاہ دوڑاتی ہوں تو مجھے فجر کے وقت ان کا جگانا یاد آ جاتا ہے۔نہایت محبت سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ روزانہ پر سوز الفاظ میں یہ شعر گنگاتیں

جاگنا ہے جاگ لے افلاک کے سائے تلے
حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سائے تلے

جب تک میں اٹھ نہ جاتی میرے سرہانے موجود رہتیں۔اللہ سے محبت،اللہ کا خوف،اللہ کا کہا ماننا،اس کی نا فرمانی سے بچنا،نماز کی پابندی کرنا، ہمیشہ سچ بولنا،جھوٹ سے بچنا یہ تمام اسباق بچپن سے ہی ازبر کروا دیے گئے تھے۔ مجھے آج بھی یاد ہے انھوں نے مجھے کہا ''زندگی میں ہمیشہ سچائی کے راستے کو اپنانا اگر کوئی تمہاری گردن پر تلوار بھی رکھ دے تو جھوٹ کبھی نہ بولنا''۔

نماز کے بارے میں بے حد متفکر رہتیں میں بعض اوقات ان کے بار بار کہنے سے جھنجھلا اٹھتی۔ایک بار میں نے ان سے کہا ''امی آپ کیا ہر وقت نماز کے لئے تلوار ہاتھ میں لیے کھڑی رہتی ہیں ابھی بہت وقت ہے پڑھ لوں گی''۔تو انھوں نے میری گستاخی کو نظر انداز کرتے ہوئے نہایت محبت سے کہا ''جانتی ہو میں ایسا کیوں کرتی ہوں کیوں کہ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں اور اپنے پیاروں کو کوئی آگ کا ایندھن بنتے نہیں دیکھ سکتا''۔

یہ کیسی محبت تھی جس کا ہر سرا اللہ کے لئے شروع ہوتا اور اللہ ہی پر ختم ہو جاتا۔ جب میں اپنی ضدوں کو پورا ہوتا نہ دیکھ پاتی تو منہ بسور کر بیٹھ جاتی تو وہ مجھے سمجھاتیں۔ ''دیکھو بیٹا رونا اچھی بات نہیں رونے والوں کے ساتھ کوئی نہیں روتا ہنسنے والوں کے ساتھ سبھی ہنستے ہیں''۔

اپنی یادداشتوں پر میں جتنا چاہے زور دے ڈالوں مجھے نہیں یاد پڑتا کہ انھوں نے مجھے کبھی ڈانٹا ہو یا مارا ہو۔ انھوں نے مجھے کبھی محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ ماں کی محرومی کیا ہوتی ہے۔ بے پناہ شفقت ہی شفقت، محبت ہی محبت، پیار ہی پیار، دلار ہی دلار۔

ماں جو تڑپے تو رگِ سنگ سے شبنم پھوٹے
آگ میں پھول کھلیں، خاک سے زمزم پھوٹے
راستہ بند جو ہو ماں کی دعاؤں سے کھلے
ماں کے اشکوں سے مرا نامۂ اعمال دھلے

زندگی کے بارے میں ان کا اپنا ہی فلسفہ تھا انھیں ہمیشہ میرے ساتھ رہنا اچھا لگتا۔ وہ اپنی بیٹی فرخندہ کے پاس تین چار روز سے زیادہ نہ رہ پاتیں اور اپنے گھر واپس آ جاتیں۔ باجی اور ان کے بچے چاہے کتنا ہی اصرار کیوں نہ کریں وہ واپسی کے لئے بضد رہتیں۔ وہ کہا کرتی تھیں جب تک پتھر اپنی جگہ پر پڑا رہتا ہے چٹان کہلاتا ہے اگر وہ اپنی جگہ چھوڑ دے تو پتھر کی طرح لڑھکتا چلا جاتا ہے۔

ماں کا لفظ اپنے اندر لا متناہی خوشبوئیں، چھاؤں اور سکون سمیٹے ہوتا ہے۔ یونہی تو نہیں کہا جاتا ''ماواں

ٹھنڈیاں چھاواں'' وہ نہ صرف میری امی تھیں بلکہ میرے بچوں کی پرورش بھی انھی کے ہاتھوں میں ہوئی میری زندگی کے تمام سرد وگرم میں وہ ہمیشہ میرے سامنے ڈھال بن کر کھڑی رہیں۔

میرے گھر میں ہمیشہ ان کے وجود سے رونق اور خیر و برکت رہی۔ خاندان کے سبھی افراد امی جان کو ملنے کے لئے بلا تکلف ہمارے گھر آتے اور دیر تک بیٹھتے ، بلا تکلف کھاتے پیتے جیسے خاندان میں کوئی ایک بڑا گھر ہوتا ہے اسی طرح میرے گھر کو یہ اعزاز حاصل رہا۔ عید بقر عید پر سبھی لوگ عید کی نماز پڑھ کر سب سے پہلے ہمارے گھر امی جان کو ملنے کے لئے آتے۔ میں ہر عید پر علی الصبح اٹھ کر آنے والے مہمانوں کی تواضع کے لئے تیاری میں لگ جاتی کیونکہ آٹھ بجے سبھی لوگ ہمارے گھر موجود ہوتے امی کے بہن بھائیوں کے بچے بھی اس طرح ہمارے ہاں آ کر خوشی محسوس کرتے جیسے نانی امی کے گھر جا کر بچے خوش ہوتے ہیں۔

اور پھر اتنی متحرک اور فعال خاتون کو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی بھٹی میں ڈال دیا۔ سردیوں کے دن تھے۔ جنوری کا مہینہ تھا جب فجر کے وقت وہ نماز کے لئے اٹھیں تو فالج نے ان کے جسم کے بائیں حصے کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ ان کا بایاں بازو ٹانگ اور چہرہ بری طرح متاثر ہوا تھا انھیں ہسپتال لے گئے ڈاکٹر کے مطابق اگلے چوبیس گھنٹے بے احد اہم تھے۔ مگر اگلے ہی روز وہ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر بستر سے اٹھ بیٹھیں۔ صبح جب ڈاکٹر راؤنڈ پر آئیں تو دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ مریضہ بستر کی بجائے کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی ہیں یہ ان کی قوت ارادی تھی جس نے انھیں بستر سے دور رکھا اور وہ کئی برس تک اپنے آپ کو سنبھالے رہیں۔

مگر وقت کے ساتھ ساتھ انسان کمزور سے کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ جنہوں نے کبھی کسی سے خدمت نہیں لی تھی اب دوسروں کی محتاج ہو چکی تھیں مگر ان کی قوت ارادی ایک بار پھر ان کے کام آئی اور انھوں نے چھڑی پکڑ کر چلنا سیکھ لیا۔ وہ نہایت بلند حوصلہ اور اعلیٰ ظرف کی مالک تھیں مزاج میں صبر کی آزمائش نے انھیں اس مشکل دور سے با آسانی گزار دیا۔

اور پھر ان کی سماعت آہستہ آہستہ ختم ہوتی چلی گئی۔ خاندان کے سبھی لوگ ان کی سماعت کی وجہ سے ان سے بات چیت کرنے سے گھبراتے پورے خاندان میں صرف میری خالہ نسیم اختر جو راشد صاحب کی والدہ تھیں (اللہ انھیں غریق رحمت کرے) وہی تھیں جو امی کو پوری توجہ اور اہمیت دیتیں وہ جب بھی ان سے ملنے آتیں نہایت عزت واحترام سے انھیں پاس بٹھاتیں اور لکھ کر ان سے ساری باتیں کرتیں۔

تمام خاندان والوں کے حال احوال تفصیل سے انھیں بتاتیں۔ ہمیشہ کہتیں ہم خود تو والدین کی عزت کرتے ہی ہیں دوسروں کی نظروں میں والدین کو احترام دینے کے لئے انھیں وی آئی پی پروٹوکول دینا چاہیے اس سے ہماری اپنی عزت میں اضافہ کے ساتھ والدین کے وقار میں بھی

اضافہ ہوتا ہے۔ جب بھی کسی دعوت پر جانا ہوتا تو ہمیشہ اصرار سے کہتیں کہ آپا کو ساتھ لے کر آنا۔

امی کبھی بھی کسی انسان سے نہ ڈریں نہ دبیں اگر ڈر تھا تو اللہ کا تھا جب تمام اعزا اقربا جمع ہوتے تو ایک ہی بات کرتیں آپ سب مجھے معاف کر دیں کسی کے ساتھ اگر زیادتی ہوگئی ہے تو وہ بھی مجھے بخش دے اگر میں نے کسی کا کچھ دینا ہے تو وہ مجھے بتا دے تا کہ قرض میرے سر سے اترے۔

آخری سالوں میں مجھے باجی کہہ کر بلانا شروع ہوگئی تھیں میں انھیں کہتی آپ مجھے نام لے کر بلایا کریں تو کہتیں تم میرے سب کام کرتی ہو تم میری باجی ہو۔ میں نے تمہیں بہت تنگ کیا ہوا ہے مجھے معاف کر دینا تو میں رو پڑتی کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں غلطیاں تو بچوں سے ہوتی ہیں معافی تو مجھے آپ سے مانگنی چاہیے۔ میری غلطیوں کے انبار پہاڑ برابر ہو چکے ہیں آپ مجھے معاف کر دیں مگر وہ اپنی بات پر قائم رہتیں کہ سب مجھے معاف کر دیں۔

انہی دنوں میرے بیٹے نے خواب میں دیکھا جیسے وہ حرم کعبہ میں کھڑا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ خانہ کعبہ کے عین اوپر ایک بہت اونچا مینار ہے جس کے گرد لوگ طواف کر رہے ہیں اور ان لوگوں کے ساتھ آپا بھی اس مینار کا طواف کر رہی ہیں۔ وہ لوگ آپا کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔

بیٹے نے جب خواب مجھے سنایا تو میں حیرت زدہ رہ گئی میں نے اس سے پوچھا کیا تمہیں معلوم ہے کہ خانہ کعبہ کے عین اوپر ایک اور خانہ کعبہ ہے جسے بیت المعمور کہتے ہیں اور اس کے گرد فرشتے طواف کرتے ہیں۔ اس نے کہا مجھے نہیں معلوم۔ تو میں نے کہا تم نے بیت المعمور کے فرشتوں کے ساتھ آپا کو طواف کرتے دیکھا ہے۔ میں یہ خواب سن کر اندر سے ڈر سی گئی تھی۔ کیا امی اللہ تعالیٰ کے خاص مقربین میں شامل ہو چکی تھیں اور ہمیں اس کا ادراک نہیں تھا۔

ان کی زندگی میں اب صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا۔ نماز، نماز اور بس نماز۔ اور پھر وہ نماز بھولنے لگیں جس کا انہیں بے حد قلق تھا۔ نماز کی فکر نے انھیں بہت رلایا۔ بعض اوقات روتے روتے ہچکی بندھ جاتی کہ میں نماز بھول گئی ہوں نہ جانے میرا کیا انجام ہوگا۔ میرے بیٹے عمار نے ان کی یہ مشکل حل کر دی اس نے پانچوں نمازیں پرنٹ کروا کر الگ الگ کاپیوں کی شکل میں تیار کر دیں وہ ہر نماز کے وقت اس کاپی کو کھول کر سامنے رکھ لیتیں اور دیکھ دیکھ کر نماز پڑھتی رہتیں پھر ان کی تسلی نہ ہوتی حتیٰ کہ دوسری نماز کا وقت آن پہنچتا۔

انھیں نماز کے لئے روتے دیکھ کر مجھے حضرت ابراہیم ادھم کا واقعہ یاد آ جاتا کہ ایک بار شیطان نے انھیں اتنی نمازیں پڑھتے اور عبادت کرتے دیکھ کر سوچا کہ کیوں نہ میں ان کی نمازیں قضا کروا دوں تا کہ ان کی عبادت میں کچھ نہ کچھ تو کمی واقع ہو جائے اس نے عین نماز کے وقت انھیں خوب گہری نیند سلا دیا۔ جب وہ جاگے تو وقت نماز جا چکا تھا۔ انھیں نماز کے قضا ہونے کا اتنا رنج ہوا کہ

روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ روتے جاتے اور اللہ سے استغفار کرتے جاتے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ اس نے ان کے درجات بلند کر دیے اور انھیں اپنے پسندیدہ بندوں میں شامل کر لیا۔ جس پر شیطان بہت پریشان ہوا اور اس نے اگلے روز انھیں خود نماز کے لئے جگانا شروع کر دیا تا کہ ان کے مزید درجات بلند نہ ہو جائیں۔

پچھلے ایک سال سے امی نے چپ سادھ لی تھی۔ مجھے لگتا تنہائی کا احساس ان کے وجود میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ جب وہ سارے خاندان کے کام نپٹاتیں تب بھی وہ تنہا تھیں تب بھی کسی نے ان سے نہ پوچھا ہو گا کہ آپ کو بھی کچھ چاہیے ہر کوئی اپنی فرمائشیں آپ کو بتا کر بے فکر ہوتا رہا۔ آج بھی کچھ ایسا ہی تھا سب اپنے اپنے گھروں میں خوش اور مطمئن تھے۔ کسی کو ان کی ضرورت نہ تھی دنیا میں ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے لاچاروں کو کس کی چاہت ہوتی ہے۔ کارآمد کامیاب لوگوں کو ملنے کی سبھی تمنا کرتے ہیں۔

مجھے امی کی خدمت کے لئے مستقل طور پر ایک مددگار کی ضرورت تھی کیونکہ یہ کام میں اکیلی نہ کر سکتی تھی۔ اس سلسلے میں مجھے اکثر و بیشتر ملازمہ کی تلاش رہتی۔ میں ہر رشتہ دار اور جاننے والوں سے اکثر اس سلسلے میں مدد کی طلب گار رہتی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ تقریباً ایک ماہ تک کسی ملازمہ کا بندوبست نہ ہو سکا۔ میں اپنی مدد کے لئے اپنی بیٹی عینی کو بلا لیتی عینی بھی آخر کتنے دن تک میرے پاس رہ سکتی تھی۔ مجھے لگا میں شاید خود بیمار پڑ جاؤں گی۔ میں نے اس روز اللہ تعالیٰ کو بڑے درد سے پکارا، یا اللہ اگر تو نے ذمہ داری ڈالی ہے تو مددگار بھی بھیج۔ میں اپنی حد تک جہاں تک ممکن ہے جس قدر ہمت ہے ان کے لئے اپنی تمام سعی کر چکی ہوں اب اگلا تیرا کام ہے۔ یہ دعا کر کے میں بے فکر ہو کر لیٹ گئی اب سارا معاملہ میں نے اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ اللہ کا کرنا کیا ہوا اگلے ہی روز ملازمہ کا بندوبست ہو گیا اس رب رحیم نے مجھ ناچیز کی دعا سن لی تھی اور امی کی وفات تک مجھے ملازمہ کے حصول کے لئے کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ ایک کے بعد دوسری ملازمہ بہت آسانی سے مل جاتی۔

پھر ایک روز امی کی طبیعت خراب ہو گئی انھیں ہسپتال لے جانا پڑا امی کو ہسپتال میں دیکھ کر مجھے لگتا تھا جیسے میرا دل شق ہو جائے گا یا اللہ میری امی کو شفائے عاملہ و کاملہ عطا فرما میں نے اس رب رحیم کون و مکاں کے والی کو پکارا وہی تو ہے جس کے آگے ہاتھ پھیلا کر میرے تمام مسئلے میری تمام پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں اسی رب نے میرے کرب کا مداوا کرنا تھا اسی نے میرے کشکول میں بھیک ڈالنی تھی وہی تو ہے جس نے میرے اشکوں کو ضائع ہونے سے بچا لینا تھا میں ہسپتال کے برآمدوں پر چلتے پھرتے اپنے آنسوؤں کو پیتے اپنے رب سے فریاد کرتی رہتی پھر مجھے لگا میری دعائیں درِقبولیت پر دستک دے رہی ہیں۔ امی کی حالت بہتر ہونے لگی۔

پھر ہسپتال میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ امی آئی سی یو وارڈ مین بیڈ نمبر ایک پر تھیں ہم سب ان کے گرد کھڑے تھے ڈاکٹرز ہمیں کہہ رہے تھے آپ ان کے پاس بیٹھ کر قرآن پڑھیں۔ ہم امید اور نا امیدی کے درمیان لٹکے ہوئے تھے کہ امی نے نیند کی حالت میں ہلکے ہلکے ہنسنا شروع کر دیا۔ جس طرح ایک دو ماہ کا بچہ نیند کی حالت میں ہنستا ہے، کھکھلاتا ہے بعینہٖ یہی کیفیت تھی۔ تمام ڈاکٹرز اور سٹاف بھی ان کے بیڈ کے گرد جمع ہو گئے۔ ہم سب حیران تھے۔ کیا وہ خواب میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں دیکھ رہی ہیں؟ کیا انھیں جنت کے باغات، پھلوں اور نہروں کی سیر کروائی جا رہی ہے یا اپنے رشتہ داروں سے ملاقات کی خوشی ہے یا کہ وہ نعمتیں انھیں دکھائی جا رہی ہیں جو دنیا کی تکلیفوں کے بدلے میں ان کے حصے میں لکھ دی گئی ہیں۔ وہ دس منٹ تک اسی کیفیت میں رہیں اور اس کے بعد وہ سو گئیں۔

پھر اس سمیع و بصیر، علیم و خبیر نے اپنی رحمت رووٴفی سے میری دعاؤں کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے انھیں ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹا دیا تھا یہ ان کے لئے بہتر تھا یا نہیں مگر مجھے تسلی ضرور تھی۔ اور اگلے روز ڈاکٹرز نے ہمیں انہیں گھر لے جانے کی اجازت دے دی۔ میں ان سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس روز خواب میں انھوں نے کیا دیکھا مگر وہ تو گھر آنے کے بعد مکمل طور پر ہم سے بیگانہ ہو گئی تھیں زبان پر جیسے مہر لگ گئی تھی کبھی کبھار کوئی لفظ سننے کو مل جاتا تو وہ ''نماز'' کا لفظ تھا یا ''سبحان اللہ'' واحد لفظ تھا جو وہ ہر کسی کو بلاتے ہوئے ادا کرتیں۔

پھر ان دنوں عجیب سی باتیں ہونے لگیں میں کسی چیز کے بارے میں سوچتی اور میری دعا پوری ہو جاتی میں اللہ تعالیٰ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ ناچیز گنہگار بندی کی بے تحاشا دعائیں قبول کیں مگر ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا کہ صرف سوچا ہو اور خواہش پوری ہو جائے۔ میں سوچتی کہ مجھ میں تو ایسی کوئی خوبی نہیں پھر میرا رب صرف میرے چاہنے سے ہی مجھے نواز رہا ہے۔ ایک روز میں امی کے پاس بیٹھی اسی سوچ میں غلطاں تھی کہ امی نے مجھے آواز دی۔ میں نے چونک کر امی کو دیکھا اور یہ راز جان لیا کہ بستر پر لیٹی میری ماں ہیں جو دھڑا دھڑ میری دعائیں قبول کروا رہی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم اور اس کی نوازشات انہی کے دم سے ہیں۔

میں نے جب رب رحیم کی مہربانیاں دیکھیں تو مجھے فی الفور ادراک ہوا کہ امی یقیناً اللہ تعالیٰ کے مقربین میں شامل ہو چکی تھیں۔ اللہ کی جس بندی نے کئی سال تک نہ کسی کی برائی کی اور نہ ہی سنی، نہ اپنی زبان سے کسی کو دکھ دیا اور نہ ہی کسی برے کام میں شامل ہوئیں، جنہوں نے اتنے برس صرف اور صرف نمازیں پڑھیں، صبر سے اپنی اس آزمائش پر پورا اتریں اور اب تو زبان پر صرف ایک ہی لفظ تھا سبحان اللہ تو کیسے نہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے قریب کر لیتا۔ میں نے اپنے بچوں سے کہا آپا پارس بن چکی ہیں اگر تم لوگ دنیا اور آخرت میں کچھ حاصل کرنا چاہتے ہو تو انکی خدمت کر لو۔ بچوں نے پوچھا پارس کیا ہوتا ہے؟

میں نے کہا پارس ایسی دھات ہے جس کے بارے میں مثل مشہور ہے کہ جو اس کو چھولے گا وہ سونے کا بن جائے گا پھر میں نے دیکھا میری چھوٹی بیٹی علینہ، میری بہو سدرہ اور بیٹے اسامہ نے پارس سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔

ایک بار میں نے کسی سے ان کی معذوری کا ذکر کیا تو انھوں نے مجھے کہا کہ ان کی اس آزمائش سے اللہ تعالیٰ کسی کی دنیا سنوار رہا ہے اور کسی کی آخرت سنور رہی ہے تم کیوں فکر کرتی ہو؟

21 فروری 2013ء کو ان کی طبیعت پھر اچانک بگڑ گئی ہم انھیں ہسپتال لے گئے ڈاکٹرز نے مایوسی کا اظہار کیا مگر میں ہمیشہ کی طرح پرامید تھی پہلے دو بار ان کی ایسی حالت ہو چکی تھی اور وہ صحت یاب ہو کر گھر آ چکی تھیں مگر اب تو ان کے پورے وجود پر بیگانگی کی کیفیت طاری تھی ویسے تو انھوں نے کافی عرصہ پہلے دنیا سے منہ موڑ لیا تھا مگر اب تو ان کی آنکھوں میں بھی بیگانگی تھی جیسے کوئی اجنبی ہو۔

میں نے اپنی بیٹی عینی اور داماد عثمان جو آج کل مسقط میں رہائش پذیر ہیں انھیں فون کر دیا کہ ڈاکٹرز نے جواب دے دیا ہے آپ لوگ فوراً پاکستان آ جائیں۔ عینی اور عثمان جو ہر ہر لمحے ہم سے رابطے میں تھے اور آنے کے لئے بے چین تھے فوری طور پر اطلاع ملتے ہی پہنچ گئے۔ میرا بیٹا عمار جو آسٹریلیا میں مقیم ہے اسے بھی راشد صاحب نے بلا لیا اور وہ بھی ان کے جنازے کو کندھا دینے اور آخری دیدار کرنے پہنچ گیا یہ سب بندوبست میرے رب کریم نے کیا جو بڑا مہربان ہے۔

اللہ رب العالمین کی جانب سے ۱۸ ربیع الثانی یکم مارچ 2013 بروز جمعۃ المبارک ان کی دنیا سے رخصتی کا دن طے ہوا تھا۔

دوپہر ایک بجے کے قریب میں اور عینی ہسپتال کے کمرے میں امی کے پاس موجود تھے کہ مجھے کمرے میں خوشبو کا احساس ہوا۔ میں نے یکدم پلٹ کر امی کی طرف دیکھا ان کی سانس تیز تیز چل رہی تھی میرا دل زور سے دھڑکا، کیا کچھ ہونے والا ہے۔۔۔ میں نے عینی سے کہا کیا تم کمرے میں خوشبو محسوس کر رہی ہو؟ اس نے چند لمحے کے لئے حیرانی سے مجھے دیکھا اور ظہر کی نماز کی نیت باندھ لی۔ تقریباً ڈیڑھ بجے سینئر ڈاکٹرز کمرے میں آئے انھوں نے امی کا چیک اپ کیا اور چند قدم بیڈ سے ہٹ کر ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر کھڑے ہو گئے قدرے توقف کے بعد بولے آپ ان کے پاس بیٹھ کر قرآن پڑھیں ان کے پاس وقت بہت کم ہے تب پہلی بار مجھے لگا کہ امی کا وقت رخصت آن پہنچا ہے۔

میں نے عینی سے کہا مجھے لگتا ہے نیک روحیں انھیں لے جانے کے لئے کمرے میں جمع ہو رہی ہیں فرشتے آ چکے ہیں دنیا سے ان کا رزق اٹھ چکا، تھوڑی دیر پہلے انجی کے ذریعے دی جانے والی خوراک نے اندر جانے سے انکار کر دیا تھا۔ کمرے میں گویا اجل کے فرشتوں کے قدموں کی چاپ محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے عینی سے کہا گھر میں سب کو فون کر دو کہ وہ آ

جائیں نہ جانے مجھے کیسے یقین تھا کہ امی کی رخصتی جمعہ کے روز اور موسم بہار میں ہوگی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ سے بہت دعا کرتی تھیں کہ یا اللہ مجھے جمعہ کے روز اپنے پاس بلانا۔ جمعے کی خشوع وخضوع سے تیاری کرنے والی اپنے رب سے ملنے کی مشتاق دنیا سے جانے کو تیار بیٹھی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں باجی فرخندہ اور ان کے تینوں بچے لقمان، عثمان اور ارم اور میرا بیٹا اسامہ ہسپتال پہنچ چکے تھے۔

کیا امی کی رخصتی کا وقت آن پہنچا ہے؟ یہ سوچتے ہی میرا دل مٹھی میں آ گیا، میری آنکھیں نم ہونے لگیں میرے قدم من من کے ہو گئے آنکھوں کے گرد جیسے دھند سی چھا گئی میں اونچی آواز میں کلمہ پڑھنے لگی۔ پھر میری آواز رندھ گئی میں رندھی ہوئی آواز میں کلمہ پڑھتی جاتی اور میری آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔

ابھی چار بجنے میں دس منٹ تھے۔ باہر موذن نے عصر کی اذان دی میں نے امی کی آنکھوں میں دیکھا۔ زندگی کی جوت ختم ہو چکی تھی۔

تھکا ہارا مسافر اپنی منزل کی طرف لوٹ چکا تھا ان کی روح قفس عنصری سے اس طرح پرسکون طریقے سے پرواز کر گئی کہ ان کا سر اپنے پیارے نواسے عثمان کے ہاتھوں میں تھا۔ دیے بجھ چکے تھے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

روح کے پرواز کرتے ہی جیسے ہوا میں یکدم خوشبوئیں پھیل گئیں ہم سب ایک دوسرے کے چہرے تکنے لگے میں نے باجی سے پوچھا کیا آپ کو کوئی خوشبو آ رہی ہے تو وہ بولیں میں بھی یہی پوچھنے والی تھی پھر ہم سبھی ان خوشبوؤں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عنبر اور لوبان کی خوشبو گلاب اور موتیے کی خوشبو سے کمرہ معطر ہو رہا تھا ہم سب سوالیہ نگاہوں سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ میری نگاہوں کے سامنے رسول ﷺ کی وہ حدیث مبارکہ آ گئی جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا نیک روحوں کے لئے سبز رنگ کا معطر کفن بھیجا جاتا ہے کیا یہ وہی خوشبوئیں تھیں، کیا وہ سبز کفن آ چکا ہے جس میں ان کی روح کو لپیٹا جا رہا ہے؟ یہ وہی لمحات تھے یہ ساری کارروائی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھی مگر اس کا ایک حصہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دکھا دیا تھا کہ نیک روح خوشبوؤں کے جلو میں اگلی دنیا کو روانہ ہو رہی ہے۔

میری امی آج اجل کے گہوارے میں محو استراحت ہیں۔ آج ان کا لباس سفید رنگ کا ہے ان کا چہرہ غموں سے بے نیاز ہے۔ بے شمار بھیگی آنکھیں ان کو بڑی عقیدت سے دیکھ رہی ہیں۔ لوگوں کا ایک سمندر ہے جو ان کے گرد جمع ہے جن کی سسکیاں ہوا میں نوحے بکھیرتی محسوس ہو رہی ہیں اور امی ہم سب سے بے نیاز اپنی دلکش منزل پر پہنچنے کو بے تاب ہیں۔ وہ جاتے جاتے مجھے آگہی کے بہت سے اسباق دے گئی ہیں جنہیں سمجھنا اور سمجھانا اب میرا کام ہے۔

جو کچھ انھوں نے میرے لیے کیا میں ان کے لئے نہیں کر سکتی تھی۔ میں تو ان کے ایک رات جاگنے کا بھی حق ادا نہیں کر سکتی۔ مجھے سب کہتے ہیں تم نے امی کی

بہت خدمت کی، مجھے معلوم نہیں خدمت کرنا کیا ہوتا ہے میں تو صرف روزمرہ کے معاملات نپٹایا کرتی تھی۔ نہلایا دھلایا کپڑے بدلوائے کھانا کھلایا یا نگرانی کی، کرسی پر بٹھا دیا اور بس وہ تھیں اور ان کی تنہائی تھی۔ کاش میں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ان کے سامنے بیٹھی رہتی مگر میں تو مصروف ہی بہت تھی۔ ان کی زندگی میں مجھے احساس نہ تھا کہ میں جی بھر کر ان کی خدمت کر لوں لیکن اب میں سوچتی ہوں اگر احساس ہو بھی جاتا تو میں کچھ نہ کرتی، اب بھی اگر چہ بہت سی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہے مگر ہم کچھ نہیں کر پاتے صرف سوچتے رہ جاتے ہیں۔

مجھے پوری امید ہے آپ نے ضرور میری کمیوں کوتاہیوں کو معاف کر دیا ہوگا میری لاپروائیوں کو نظر انداز کر دیا ہوگا آپ نے یقیناً ہمارے لیے بہت سی دعائیں کی ہیں جس کے لئے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ ہمیں دنیا میں بھی کامیابیاں چاہئیں اور آخرت میں بھی خصوصاً جنت میں آپ کا ساتھ چاہیے۔

میرا تو قرآن کی اس آیت پر ایمان ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد بھی کسی درجہ ایمان میں ان کے نقشِ قدم پر چلی ہے ان کی اس اولاد کو بھی ہم جنت میں ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل میں کوئی گھاٹا نہ انکو دیں گے'' (سورۃ طور ۵۲)۔

پس میں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے اور میرے بچوں کو جنت الفردوس میں امی اور میرے والدین کے ساتھ ملائے اور ہم سب کو ان کے لئے صدقہ جاریہ بنائے (آمین)۔

☆☆☆

ذکیہ فرحت

یہ شمع حق کے پروانے

یہ میدان التحریر ہے جو سجیلے بانکے جوانوں، جھکی کمر وشانوں والے بوڑھوں، بچوں اور مردوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ جو جمہوریت کے دلدادہ، آزادی پسند، حق پرست، ظلم کی چکیوں میں پستے ہوئے ہر قسم کے ظلم وزیادتی کا مزہ چکھتے ہوئے، اذیت ودرندگی کا شکار بنے ہوئے 40 سال سے ظالم حکمرانوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے لوگ ہیں۔ مگر ان کے چہرے پر مایوسی واداسی کیوں نہیں۔ یہ عزم وحوصلے کا عظیم پیکر بنے ہوئے ہیں۔ ان کی پیشانیوں پر صبح تازہ کی روشن امید ہے۔ یہ یہاں محفل سجائے بیٹھے ہیں۔ ان کا نعرہ جمہوریت، ان کا مطالبہ پنجۂ استبداد سے آزادی اور ان کا مقصود رب کی رضا ہے۔ پھر یہ ہوا کہ ان کے خلوص، ان کی سچائی اور حق کے لیے ان کے دل کی تڑپ اور لگن نے رنگ لایا، ظالم حکمران ان کے عزم وہمت واستقلال اور کوہ استقامت کے سامنے ٹھہر نہ سکے اور ان کے جوش وجذبے اور ولولۂ تازہ کے سیلاب میں خس وخاشاک کی طرح بہہ گئے اور اقوام عالم نے بہ چشم سر یہ نظارہ دیکھا کہ جمہور کی طاقت سے جمہوری طریقے اور عوام کے ووٹوں کے ذریعے مصر کی سرزمین پر ایک اسلامی حکومت وجود میں آئی۔ ایک مدت کے بعد آمریت کی چلتی ہوئی بادسموم میں تازہ ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا فضا کو معطر کر گیا۔

مصر کے تختۂ اقتدار پہ اس کے اصلی وارث متمکن ہوئے کیونکہ حکمران کا اصل حق تو سچے حق پرستوں ہی کا ہے، کعبہ کے متولی تو وہی لوگ ہیں جو اللہ اس کے رسولؐ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں (القرآن) مگر پھر یہ کیا ہوا کہ آئینی جمہوری اور اکثریتی ووٹوں سے قائم ہونے والی حکومت کو عسکری قوت سے الٹ دیا گیا۔ وہی جمہوریت جسے دنیا اور عالمی قوتیں امریکہ، برطانیہ اور فرانس و پورا یورپ اصل نظام حکومت مانتا ہے۔ جو دن رات جمہور کے حقوق کی بات کرتے نہیں تھکتے، جو ہر دم جمہوریت کے راگ الاپتے رہتے ہیں۔ مگر مصر کی آئینی جمہوری حکومت ان سے کیوں برداشت نہ ہوئی۔ اس کا تختہ الٹ دیئے جانے پر وہ شادیانے بجا رہے ہیں۔ اپنے ہی عوام پر فوج کشی کرنے والے فوجی سربراہ السیسی کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں کہ شاباش بہت اچھا کیا۔ غیر آئینی وغیر جمہوری طریقے سے جمہوری حکومت کا گلہ گھونٹنے والے اس درندہ صفت انسان کے لئے خزانے کا منہ کھول دیا گیا ہے۔ اسے اربوں روپے کی امداد دی جارہی ہے۔ وہ پیسہ جو ملک کے عوام کی

بہبود پر خرچ ہونا تھا اسے سفا کی اور درندگی پر بطور انعام دیا جارہا ہے۔ سچ کہا تھا شاعر مشرق نے ؎

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

اور اب یہ رابعہ العدویہ کا میدان ہے آج پھر یہ میدان حق کے پرستاروں، جاں نثاروں، عزم وہمت کے شہسواروں، اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے والے حق کے شہیدائیوں سے بھرا ہوا ہے جس میں ہر فرقے، ہر طبقے اور ہر ملک کے وہ لوگ ہیں جو اس ملک میں اسلام اور اسلامی حکومت کے خواہاں ہیں۔ اپنے رب کی رحمت کے طلب گار ہیں۔ جو اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام قائم کرنا اور دیکھنا چاہتے ہیں۔ رمضان کا پورا مہینہ اس کی مبارک گھڑیاں انہوں نے اسی میدان میں روزوں، تلاوتوں، تہجد گزاریوں اور شب بیداریوں میں گزاری ہیں۔ جن کی جبینیں صرف اور صرف اپنے رب کے آگے سجدہ ریز رہی ہیں۔ ان میں بوڑھے بھی ہیں جوان بھی ہیں، عورتیں بھی۔ ان کا مطالبہ اپنی آئینی حکومت کی بحالی ہے جوان کا حق ہے وہ اپنا حق مانگ رہے ہیں۔ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے جو اسے اس کے رب نے عطا کیا ہے اور ساری جمہوری دنیا بھی اس حق کو تسلیم کرتی ہے۔ مگر چشم فلک نے دیکھا کہ اپنا حق آزادی مانگنے والوں پر ٹینک چڑھا دیئے گئے ہیں۔ میدان میں جمع انتہائی پرامن، معصوم اور نہتے لوگوں کو ٹینکوں سے کچل ڈالا گیا۔ مسجد کو آگ لگا کر انہیں زندہ جلا دیا گیا ہے۔ جس کے ہاتھوں میں چاقو، چھریاں، ڈنڈے اور پتھر تک نہیں انہیں مشین گنوں سے بھون ڈالا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ یہ نہتے اور پرامن لوگ فراعنہ مصر کے ان درندوں کا مقابلہ کس صبر واستقامت سے کررہے ہیں۔ دنیا برسوں سے ایک کربلا کو روہی تھی آج میدان رابعہ کو میدان کرب وبلا بنادیا گیا ہے مگر دنیا خاموش تماشائی ہے۔ ایسا کیوں؟ یہاں جوان لاشے تڑپ رہے ہیں۔ ماؤں کی گود میں ان کے بچے دم توڑ رہے ہیں۔ بوڑھے باپ جوان بیٹوں کے لاشے اٹھارہے ہیں۔ آہیں ہیں، سسکیاں ہیں، دم توڑتے بچے اور جوان ہیں۔

؎ آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

ہاں ان کے رب کو ان کی آزمائش مقصود ہے اور ان جیالوں، شمع حق کے پروانوں کو اپنے رب کی رضا مطلوب ہے ؎

شہادت ہے مطلوب ومقصود مومن۔ نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

مگر دیکھئے تو سہی ان زندہ دلوں کو، حق کے متوالوں کو ان کے عزم وہمت میں کوئی کمی نہیں۔ ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ''جنت تو تلواروں کے سائے تلے ہے۔'' یہ نارنمرود

جو وقت کے فرعونوں کے ہاتھوں بھڑکائی گئی ہے اس کا علاج صرف عصائے موسیٰؑ میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ ہر فرعون کے لئے ایک موسیٰ ضرور پیدا ہوتا ہے اور ظلم جب حد سے گزر جائے مٹ جاتا ہے۔''جو چپ رہے گی زبان خنجر،لہو پکارے گا آستیں کا''۔لیکن،ظلم و بربریت کی یہ داستان جو میدان رابعہ میں رقم کی جارہی ہے درندگی وبہیمت کی جو انتہا کی گئی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟ دنیا حیرت زدہ ہے کہ آخر ان کا جرم کیا ہے۔ابھی تو ان کو اقتدار میں آئے صرف ایک ہی سال ہوا تھا اور اس ایک سال میں بھی اسے سازشوں کے کئی پل صراط سے گزرنا پڑا تھا۔ابھی تو یہ نوزائیدہ تھی ایک سال محض ایک سال اس مدت میں ایک بچہ بھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہوتا۔اور یہ تو وہ ملک ہے جہاں کے لوگوں نے تیس چالیس تک جمال ناصر،انور سادات اور حسنی مبارک کی آمرانہ حکومت کو بہ خوشی قبول کیا ہے پھر یہ ایک سال انہیں بھاری کیوں لگا کہ اس کا بوجھ نہ اٹھا سکے۔مگر یہ فراعنہ مصر ہیں۔ظلم کے پروردہ،ظالموں اور نافرمانوں کی دریافت، یہ فرمانبرداروں ،امن پسندوں اور توحید کے نام لیواؤں کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟

وہ دیکھئے محمد البلتاجی کی 18 سالہ جواں سال بیٹی اسماء البلتاجی جسے نشانہ لے کر مارا گیا اسکی ہنستی مسکراتی تصویر زندگی کا کیسا زندہ پیغام دے رہی ہے۔ وہ کہہ رہی ہے ؎

برقرار اندیشۂ سودوزیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز وفردا سے نہ ناپ
جاوداں،پیہم دواں ہردم جواں ہے زندگی

تسلیم ورضا کا یہ حسین پیکر ہمیں یہ درس دے گئی ہے کہ ''شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے۔''

اور اس کلام ربانی کا یقین کہ ''تم انہیں مردہ نہ کہو وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں مگر تمہیں اس کا شعور نہیں ہے''(القرآن)دین کے دشمن اپنی دانست میں انہیں مٹا نے چلے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے ان کا خاتمہ کر دیا ۔مگر انہیں نہیں معلوم کہ حق کی خاطر گرنے والے خون کے ایک قطرے سے ایک ہزار مجاہد پیدا ہو سکتے ہیں''خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا''

اخوانیو! گھبراؤ نہیں،سید النساو سید وقطب شہید کے بیٹو اور بیٹیو! غم زدہ نہ ہو،ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ہم تمہارے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ ہمارے دل تمہارے ساتھ دھڑک رہے ہیں۔ ہماری آنکھیں اشکبار ہیں۔ ہمارے ہاتھ رب العزت کی بارگاہ میں اٹھے ہوئے اور ہمارے لب دعا گو ہیں۔اللہ تمہاری حامی وناصر ہو۔ تمہیں فتح ونصرت سے ہمکنار کرے اور شہداء کو عظیم مرتبے پر فائز کر کے ہمیشہ کے لئے جاوداں کر دے آمین۔

☆☆☆

محشرِ خیال

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی۔کراچی

بتول کا اگست کا شمارہ ملا۔ بتول مجھے نہایت پابندی سے اپنے وقت پر مل جاتا ہے۔ پڑھ لیا ہے۔آپ کا جذبہ ایثار متاثر کرتا ہے۔ یہ نیکیاں پھیلانے کے مترادف ہے۔ قاری کا ذہن متاثر ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح سے تبلیغ کا کام ہے۔اسے اس جذبے سے قائم اور جاری رہنا چاہیے۔ یہ اللہ کی طرف سے توفیق ملی ہوئی ہے۔آپ کے حق میں دعا گو ہوں۔

شاہدہ ناز قاضی۔لاہور

پیارے بتول! تو سدا کھلاتا رہے ہر نفس میں پھول.....

جس پھول کی شادابی پر کبھی پڑے نہ وقت کی دھول.....

وہ قدم قدم اجالا بکھیرا کہ جگمگ ہوگئی .....

کہیں حمد ربانی نے دامن تھاما کہیں دل میں اتری نعتِ رسولؐ.....

بتول کے لیے آپ میری چاہت کا اندازہ اس بات سے لگا سکتی ہیں کہ دو سال جو میری غیر حاضری کے تھے میں نے لاہور پہنچتے ہی اگلے روز آپی کو فون کر کے اپنے پہنچنے اور بتول کے پرانے شمارے لینے کی درخواست کر دی۔

آپی آپ کا بہت بہت شکریہ۔کس پیارے سے آپ نے میرے لیے سارے شمارے اکٹھے کیے اور میں جب انھیں سمیٹے ہوئے گھر لوٹی تو مجھے لگا کہ ایک بڑا سا گلدستہ اٹھا لائی ہوں میری روح خوشی سے سرشار ہوگئی تھی۔

آدھے سے زیادہ شمارے تو میں پڑھ چکی ہوں۔ اف ..... اتنی حساس قلم نگاری! ایسے ایسے نایاب واقعات..... صائمہ اسماء کا وہی تیر و نشتر چلاتا قلم۔ فرزانہ چیمہ کا وہی لا جواب انداز دلبری وہی ہنستے ہنساتے گہری بات کی رمز۔حمیرا خالد، ڈاکٹر شگفتہ نقوی، قانتہ رابعہ، ڈاکٹر بشریٰ تسنیم، آسیہ راشد، شمیم فاطمہ غرض کس کس کا نام لوں ہر طرف بہار ہے۔ ہاں مجھے بہت اچھا لگا ''نمایاں خواتین کا تذکرہ'' شاندار اور معلوماتی تحریر ہے۔ بخدا مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مجھے حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ کی اہلیہ کے نام نہیں معلوم تھے شکریہ آسیہ راشد، شکریہ بتول میرے علم میں اضافہ کیا۔ یہ سلسلہ بند نہیں ہونا چاہیے۔

محترمی ڈاکٹر مقبول احمد شاہد صاحب کے مضامین حکمت اور دانائی کا سرچشمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں جانے ان گنت انسانوں کی مسیحائی کا کام لے چکا ہے..... اور اب اگر وہ لکھنے کی طرف آئے ہیں تو ایسے لگ رہا ہے جیسے وہ صرف جسمانی عوارض کے مسیحا نہیں بلکہ روحانی ، ذہنی، معاشرتی

بیماریوں کے خلاف بھی یونہی اپنی جنگ جاری رکھیں گے اور اپنے قیمتی وقت سے کچھ لمحے نکال کر بتول کے قارئین کے لیے ایسا علم مہیا کرتے رہیں گے جو ہم سب کے لیے اثاثہ بن جائے گا۔

آخر میں ایک بار پھر آپی ثریا اسماء کو اتنی خوبصورتی سے اور انتھک محنت سے رسالے کی آبیاری کرنے پر مبارکباد دیتی ہوں۔

میں یہاں رسالے کے سرورق کی تعریف بھی کر وں گی جو اتنے آرٹسٹک ہیں کہ دل چاہ رہا ہے ان کو پینٹنگ میں اتار لوں۔

محترمہ بنت مجتبیٰ مینا کی رحلت کا پڑھ کر اور جان کر صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے ..... اور جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔ آمین ۔ خط بہت لمبا ہوتا جا رہا ہے ..... سب قارئین کے لیے بہت سی دعائیں۔

سیدہ فاطمہ گیلانی۔ساہیوال

کچھ وجوہات کی بنا پر محشرِ خیال سے غیر حاضر رہی دل اداس ہو گیا۔آج ہی سفر سے واپسی پر مطالعہ کرنے کے بعد کاغذ قلم لے کر بیٹھی خیالات کا اظہار کر رہی ہوں۔اللہ کرے راستی کی گواہی ہو۔خوشامد یا بخل نہ ہو بلکہ دعوت الی اللہ کا مصداق ہو۔''اداریے'' میں بیٹی صائمہ نے کشکول دوبارہ پھیلانے کا تذکرہ کیا ہے جو بہت بڑا قومی المیہ ہے۔خاص مضمون ''فگاروں کا سفر'' مشکور حسین یاد کا ایک نمونہ ہے ان لاتعداد قربانیوں کا جو دے کر پاکستان معرض وجود میں آیا۔''قرآن کا معجزہ'' تو کیا ہی بات ہے، ایمان دوبالا کرنے کے لیے ایسی ہی تحریریں ہونی چاہئیں۔الحمدللہ جزاک اللہ''پلو میں گرہ'' میں حفصہ اقبال نے بڑے اچھے انداز میں بآسانی اتنی پیاری بات پیش کر دی۔''ملال'' میں فرحی نعیم نے خوب جھنجھوڑا اور ہلا کر رکھ دیا۔''پہلا پاکستانی'' کیسا دردناک منظر ہے۔کیا ہمارے حکمران سکول میں پاکستان کے بارے میں کچھ نہیں پڑھتے۔''اے میرے مالک'' محترمہ رخسانہ جبیں کی بہترین تحریر ہے۔ وہ مالک تو ہے ہی ایسا کہ اس سے بہتر سے بہتر انداز میں التجا کی جائے۔

میری بے حد دعائیں بتول کی پوری ٹیم اور لکھنے والی بہنوں کے لیے۔خدا ہم سب کو اپنی خاص عنایت سے جنت میں ملاقات کروائے (آمین)۔

رفعت اشتیاق۔گوجرہ

معذرت خواہ ہوں کہ بتول کے قاری سے رابطہ منقطع رہا طبیعت اور موسم کی ناسازی وجہ بنی۔ورنہ بتول تو اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوگر ہوتا رہا ہے۔ اس دفعہ تو چودہ اگست کے حوالے سے مضامین نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔کچھ ہی تو دنوں کی بات ہے جب یہ لوگ ہمارے ساتھ تھے، ہمارے لیے راہ عمل متعین کرنے والے''فگاروں کا سفر'' یقیناً حساس دلوں کے لئے قندیل روشن ثابت ہوا۔مشکور حسین لکھتے ہیں۔''یا رمشکور! ہمت سے کام لے،تو نے تو لڑکیوں کو بھی مات

کر دیا۔'' پھر فوراً ہی محبت بھرے لہجے میں بولے'' بھئی میں تمہیں اپنے کاندھوں پر اٹھالیتا لیکن یہ بات کچھ اچھی نہیں لگے گی۔''

محترمہ شمیم فاطمہ کا'' برکتوں والی رات'' اور'' دھرتی کی اداسی'' عذرا مریم کا'' پیاری دوست کیلئے'' تینوں اچھی کاوش ثابت ہوئیں۔ قانتہ رابعہ کا'' یہی تو جنت کا راستہ ہے'' یقیناً نسلِ نو کی تربیت کا حق ادا کر رہی ہیں۔ والدین کی تربیت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔'' میری لائبریری سے'' ام ایمان کا بے خوف، پلو میں گرہ، ملال سب ہی سلسلے بہترین ہیں، ربیعہ ندرت نے'' محبت نام ہے جس کا'' میں عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کا سفر اس طرح کروایا لکھتی ہیں'' ہم سب کی داستانِ محبت کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی جب ہم ہوش وخرد اور شعور سے بے گانہ تھے۔ اس کا آغاز ہماری زندگی کے اولین لمحے سے جڑا ہوا ہے، جب وہ عظیم وبرتر ذات بہت محبت سے ہمیں عدم محض سے وجود میں لائی اور ہمارے وجود میں آنے سے پہلے اس جہانِ پیر کو ہمارے لیے آراستہ کیا۔'' بہرحال یہ سب چشمِ بینا کے بغیر ممکن نہیں۔

؎ نگاہِ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے۔

ماشاءاللہ نو صفحات پر مشتمل ڈاکٹر بشریٰ تسنیم کا'' پہلا پاکستانی'' پڑھتے ہوئے زندگی میں پہلی دفعہ تشکیل پاکستان کے سلسلے میں روحانی بشارتوں کا علم ہوا۔ یقیناً ایسے لکھاری تو بحرِ علم کے ایسے موتی ہیں جن کی قدر کوئی علم والا ہی جان سکتا ہے۔ ہمارے وطن کا سرمایہ ہیں یہ۔ لکھتی ہیں'' مجھے اتنی حیرت ہوئی کچھ باتوں کو جان کر کہ قائداعظم اور علامہ اقبال دونوں کو ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پاکستان بنانے کا فریضہ سونپا گیا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ، ظفر احمد عثمانی، شبیر احمد عثمانی کے علاوہ اور بہت سے جید علماء اور اولیاء اللہ نے گواہی دی کہ حضور اکرمؐ نے اپنی منشاء سے پاکستان بنوایا اور سب سے زیادہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی نگرانی اور منشاء کے مطابق اس کا انتظام فرمایا۔ آپ نے بالکل درست فرمایا کہ یہ اسی پاک وطیّب شہر نبیؐ کا تسلسل ہے۔''

'' انچاس برس پہلے'' خرم مراد کی اہلیہ کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ ہم جیسے زندگانی کی راہیں کھوٹی کرنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوا۔ ماشاءاللہ ہماری جنس کو اللہ نے یہ توقیر بخشی۔ ان کے لئے یہی کہوں گی کہ جو خدا کے ساتھ سودا کرتا ہے وہ کبھی نقصان نہیں اٹھاتا۔ آخر میں بتول کی مدیرہ اور تمام ٹیم کیلئے دعا گو ہوں۔

اسامہ ربانی۔ پشاور

آج لگتا ہے کچھ انہونی سی ہوگئی ہے، اگست کا چمن بتول سات کو مل گیا، شکر الحمدللہ۔

سرورق ہمیشہ کی طرح بہترین اور اچھوتا تھا مگر پرنٹنگ صاف نہیں تھی۔ Blurr سا لگ رہا تھا۔ آخر سے پڑھنا شروع کیا۔ بتول میگزین میں'' چلو کہ منزل بلا رہی ہے'' از محترمہ حفصہ افضال نے دل پر دستک دی۔ بقول محترم اختر عباس جو چیز دل سے لکھی جائے اثر رکھتی ہے۔ اور یہ تحریر یقیناً دل کے بہت اندر سے لکھی گئی

ہے۔محترمہ عصمت اسامہ حامدی کا ''وقت دعا ہے'' اس عالم میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے متعلق تھا۔مسلم امہ کو یک جہتی کا مظاہرہ کرنا چاہیے، مگر شومئی قسمت کہ مسلم ممالک ہی مختلف آراء میں منقسم ہیں۔ ؎

ہے دعا یاد مگر حرفِ دعا یاد نہیں

''رب سے ملاقات'' محترمہ ڈاکٹر بشریٰ تسنیم نے گویا دل کے تار چھیڑ دیئے۔''اپنے نفس کی طمانیت درکار ہے، یا اپنے قلب وروح میں نیکی کی اور رب دوجہاں کے قُرب کا احساس، نفس تو کبھی مطمئن نہیں ہوگا۔ رب دوجہاں قدردان ہے ذرے کو آفتاب بنا سکتا ہے۔''

''مرسی کے بھیانک جرائم'' ڈاکٹر عامر لیاقت حسین آج کل میڈیا کی فحاشی اور یک طرفہ پالیسی پر کڑی تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ بہت جلد ان کے ساتھ محترم انصار عباسی جیسا ہونے والا ہے۔

''اے میرے مالک!'' ازمحترمہ ڈاکٹر رخسانہ جبین کے بارے میں میرے جو احساسات ہیں ان کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔''بی بی! اپنے اللہ کے نام پر کچھ دے دو..... میں نے بے خیالی میں چند سکے نکال کر اس کی طرف اچھال دیئے.....لیکن..... جب اس کے الفاظ کی قیمت کا اندازہ ہوا تو میرا جی چاہا کہ اسے پھر سے آواز دوں.....اور سارے پیسے اس کے کشکول میں ڈال دوں۔اگر وہ اک بار پھر کہہ دے..... بی بی! اللہ کے نام پر کچھ دے دو.....''

''انچاس برس پہلے'' آزمائشوں میں گزرے ہوئے ساعتوں کا وہ ابتدائیہ ہے کہ جن میں بہت سے اپنے دل کی طمانیت حاصل ہونے کی بات کرتے ہیں اور واقعی یہ آزمائشیں ہی تو ہیں کہ جو دل کو ٹٹولتی ہیں، اس اللہ کے نزدیک کرتی ہیں اور ایمان تازہ کرتی ہیں۔

''ہوئے ڈر کے ہم جو رسوا'' استاد کے ڈر سے بچوں کی دعاؤں اور تصور میں استاد جتنے رسوا ہوتے ہیں شاید ہی کوئی اور ہو۔

اجنبی مسافر میں black pool tower کے شیشے کی زمین پر ہم بھی خیالوں میں چل نکلے۔

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم صاحبہ کے ''پہلا پاکستانی'' کی آخری بات ''حوضِ کوثر میں پہلے پاکستانی کے حضور گزارش کروں گا۔آقاؐ! آپؐ کے پاکستان کیلئے میں کچھ نہیں کرسکا۔ اسکو صرف دو آنکھوں کا نظریہ پیش کرسکا ہوں۔ نے کپکپا سا دیا۔

رمضان میں فرحی نعیم کا ''ملال'' ہونا چاہیے مگر ہم رمضان کی روح کو سمجھتے ہی نہیں۔

زندگی تو نام ہے اپنے نفس پر پابندیوں کا، محترمہ حفصہ افضال کی ''گرہ'' ہر کسی کو باندھنا چاہیے۔

محترمہ قانتہ رابعہ کا ''یہی تو جنت کا راستہ ہے'' بہترین افسانہ تھا۔

محترم مشکور حسین یاد کا صبحِ آزادی ''فگاروں کا

سفر'' اگست کے حوالے سے اچھا انتخاب تھا۔

''اور لوگوں سے اچھی بات کہو'' محمود غزنوی نے موضوع کے ساتھ انصاف کیا۔

اور آخر میں ''ابتداء تیرے نام سے'' حالات حاضرہ کے حوالے سے اچھا تو ہوتا ہی ہے۔

بتول نے اپنا ویب گاہ متعارف کیا ہے، مبارکباد دیتے ہیں، میرے نزدیک بتول ہی واحد رسالہ ہے جو بہت زیادہ Well planned ہے۔ ہر مواد کے لئے اپنی جگہ اور ہر سلسلہ بہت حد تک مستقل۔

عائشہ مظفر- جدہ

بتول جولائی کے آخر میں ملا۔ نوائے شوق میں بنام عافیہ، توحید خالص اور عفیرہ زینب کی غزل اچھی لگیں۔ افسانوں میں سب سے اچھا ''باس'' ام حمزہ لگا۔ مضامین اس مرتبہ سب ہی بہترین تھے۔ ڈرون آپریٹر کا عبرتناک انجام'' حالاتِ حاضرہ کے حوالے سے اچھا انتخاب تھا۔

''آیئے اصلی روزہ رکھیں!'' میں مصنفہ نے ہلکے پھلکے انداز میں رمضان میں عمومی خامیوں پر تنقید کی ہے۔ یہ بات بھی سو فیصد درست ہے کہ اکثر روزہ دار ''حالت غصہ'' میں پائے جاتے ہیں۔ محترمہ حمیرا مودودی کا انٹرویو بھی بہت اچھا لگا۔

آخر میں بتول کی پوری ٹیم کو عید مبارک۔

☆☆☆

فرخندہ شاہین

قدرت کا تحفہ..... کھجور

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر کھجور کا ذکر موجود ہے۔ سورۃ الرحمٰن کی دسویں آیت میں ذکر فرمایا گیا ''میوے اور غلاف والی کھجوریں'' میوے کے تذکرے کے بعد کھجور کا ذکر اس کی افادیت واہمیت کو ظاہر کرتا ہے جس کی وضاحت نبی کریمؐ کے ان ارشادات سے ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ فرماتے ہیں کہ ''میں نے نبی کریمؐ کو دیکھا کہ آپؐ تازہ کھجوریں اور ککڑی ایک ساتھ تناول فرماتے تھے۔'' کھجور اور ککڑی کا استعمال صرف ایک اتفاق نہ تھا بلکہ نبی کریمؐ نے اپنے اس عمل سے کھجور کی گرم تاثیر اور ککڑ کی سرد تاثیر کو معتدل کرنے کا طریقہ سکھایا۔

آپ مکھن کے ساتھ کھجور کو بہت پسند فرماتے تھے۔ کھجور پر ہونے والی جدید سائنسی تحقیقات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس میں پائے جانے والے معدنی نمکیات، قلب کی حرکات کو منظّم رکھتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک صحابیؓ رسول کریمؐ کے سینے میں تکلیف ہوجانے کی صورت میں نبی کریمؐ نے 12 عدد کھجوریں گٹھلیوں سمیت پیس کر پلانے کی ہدایت فرمائی جس سے ان صحابیؓ کا درد ختم ہوگیا۔ سعد بن ابی وقاصؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا ''جس نے صبح اٹھ کر عجوہ کھجور کے دانے کھائے اس دن اسے سحر (جادو) اور زہر بھی نقصان نہیں دیں گے۔''

جگر کی بیماریوں میں اکثر مختلف زہریلے اثرات سبب بنتے ہیں۔ ان کے علاج کے لئے نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ''کھجور میں شفا ہے اگر نہار منہ کھائی جائے تو اس میں زہریلے مادوں کا تریاق ہے۔ یرقان کی بیماری میں صفرا کی نالیوں میں رکاوٹ آجاتی ہے اس کے لئے طب نبویؐ کے مطابق کھجوری ہی اس کا علاج ہے۔

اس کے علاوہ کھجور کے استعمال سے اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ خون میں کولیسٹرول LDL کی سطح نہیں بڑھتی کولیسٹرول کی سطح اگر جسم کے خون میں بڑھ جائے تو ہارٹ اٹیک کا باعث بن سکتی ہے۔

دماغی کام کرنے والوں کے لئے بھی کھجور بہت موزوں ہے کیونکہ اس میں موجود لحمیات، وٹامنز اور منرلز دماغ اعصاب کو تقویت بخشتے ہیں۔

عرق کھجور

7 عدد کھجوریں، 500 گرام دودھ اور حسب ذائقہ چینی لیں۔ کھجوروں کو دھو کر دودھ میں ڈال دیں۔ ہلکی آنچ پر اس وقت تک ابالیں کہ گھٹ کر نصف رہ جائے، پھر چینی ملا کر گٹھلیاں الگ کردیں۔ یہ طاقتور مشروب دماغ تیز کرنے اور رمضان میں گرمی کی شدت دور کرنے کے لیے نہایت موزوں ہے۔

☆☆☆

بتول میگزین

گونج

روبینہ عاطف۔ کراچی

''ہاں بھئی کیا ہو رہا ہے؟'' صاحب نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''دنیا کا سب سے مشکل کام کر رہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''''کام'' لیکن آپ تو خاصی دیر سے فارغ بیٹھی ہیں۔'' چھوٹے صاحبزادے نے فوراً تبصرہ کیا۔

''آپ تو خاموش ہی رہیے افلاطون صاحب۔'' میں نے گھور کر کہا۔ ''یہ لڑکا بھی ناں بال کی کھال اتارنا شروع کر دیتا ہے۔'' میں بڑبڑائی۔

''چھوڑو بھئی تم یہ بتاؤ وہ کون سا مشکل کام ہے جو تم نے اپنی کمزور جان پر لے لیا۔ ہم نے تو ہر طرح آرام پہنچانے کی کوشش کی۔'' میاں صاحب تابعداری جتاتے ہوئے بولے۔

''فری کا SMS آیا تھا کہ ''دنیا کا سب سے آسان کام ہے دوسروں پر تنقید کرنا اور سب سے مشکل کام اپنی اصلاح کرنا۔'' بس وہی دل پر اثر کر گیا۔ آج کل اپنی ''اصلاح'' کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔''

''یہ تو واقعی ''خاصا مشکل'' کام ہے۔'' انھوں نے خاصا مشکل پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب!'' میں تنک کر بولی۔

''بھئی میں تو تمھاری ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔'' انھوں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ اس سلسلے میں کیا اقدام کیے جا رہے ہیں۔''

''یہی تو سوچ رہی ہوں کہ آغاز کیسے کروں۔ بزرگوں کی رائے لیتی لیکن میرے اور آپ کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔ سوچ رہی ہوں بہنوں بھائیوں سے رائے لوں۔''

''نہ نہ خدا کے لیے ایسا غضب نہ کرنا۔'' وہ تڑپ کر بولے۔

''کیوں بھلا۔'' میں نے پوچھا۔

''بھئی اللہ کا احسان ہے سب کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں اب کسی نے کچھ سچ بول دیا اور مزاج کو ناگوار گزرا تو اچھے بھلے تعلقات بگڑ جائیں گے، اس پنڈورا بکس کو نہ ہی کھولیں بڑی مہربانی ہوگی۔'' ان کی بات میں وزن تھا اور لہجہ اس سے بھی زیادہ وزن دار اس لیے اس خیال سے تائب ہوئی۔

پھر آخر اصلاح شروع کیسے کروں۔ کافی دن اسی سوچ و بچار میں گزر گئے۔ آخر سوچا اول خویش بعد درویش اچھے کام کی ابتدا اپنے گھر سے کرنی چاہیے۔ چنانچہ کاغذ لے کر دونوں بیٹوں کے پاس گئی اور کہا۔

''آپ کے خیال میں اچھے والدین میں کیا کیا خصوصیات ہونی چاہئیں۔ وہ لکھ دیں۔''

وہ تو جیسے خیالات کے اظہار کے لیے تیار بیٹھے تھے لکھتے کہاں فی البدیہہ تقریر کی طرح شروع ہو گئے۔

بڑے صاحبزادے جنھیں شادی کا خاصا شوق ہے فرمانے لگے کہ ''والدین کو بچوں کی شادی جلدی کر دینی چاہیے اور ان کے اخراجات بھی برداشت کرنے چاہئیں۔''

چھوٹے صاحبزادے کہاں پیچھے رہنے والے تھے۔ فرمانے لگے ''اچھے والدین کو بچوں کو ہر وقت پڑھنے کے لیے نہیں کہنا چاہیے۔ اور یہ بھی نہیں پوچھنا چاہیے کہ کہاں جا رہے ہو اور کب تک آؤ گے؟''

ان کے نادر خیالات سن کر میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''اگر اچھے والدین کا یہ معیار ہے تو میں تو کبھی ''اچھی ماں'' نہیں بن سکتی۔ آپ لوگ مہربانی کر کے کاغذ واپس کر دیں۔'' میں نے کہا۔

''کیوں بھئی یہ کون سے کاغذات واپس ہو رہے ہیں۔'' کمرے میں داخل ہوتے ان کے ابا جان نے پوچھا۔ میں نے پوری بات ان کے گوش گزار کی۔

''ہاں تو اس میں کیا مشکل ہے۔'' انھوں نے کہا۔

''جی کیا مشکل ہے۔'' میں نے حیرت سے انھیں دیکھا۔ لیکن انھوں نے آنکھ کے اشارے سے مجھے تسلی دی اور بچوں کی طرف مڑ کر کہنے لگے۔ ''ہاں بھئی یہ سب باتیں بالکل قابل عمل ہیں بس انسان کی کرنے کی نیت ہونی چاہیے۔''

''بالکل جی، بالکل'' بچوں کی تو باچھیں کھل گئیں کہ کوئی ان کی طرفداری کر رہا ہے۔ ''آپ دونوں ایسا کریں یہ سب باتیں لکھ کر نیچے اپنے اپنے دستخط کر دیں'' وہ مجھ سے مخاطب ہوئے ''اور آپ چونکہ یہ سب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں اس لیے یہ کاغذ سنبھال کر رکھیں اور مستقبل میں ان کے بچوں کو دے دیں تاکہ وہ مستفید ہو سکیں۔'' یہ سنتے ہی دونوں صاحبزادوں کے ہاتھوں کے طوطے چڑیاں سب اڑ گئے۔ اُنھوں نے خالی کاغذ میز پر یوں پھینکے جیسے کوئی بم ہو جو پھٹ جائے گا۔

صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ''یاد رکھو یہ زندگی گونج کی مانند ہے اچھا برا غلط صحیح سب پلٹ کر تمھاری طرف آتا ہے اس لیے زندگی کو اپنی بہترین چیز دو تاکہ بہترین ہی پلٹ کر تمھاری طرف آئے۔ اصول وہ بناؤ جن پر خود بھی عمل کر سکو۔''

لاشعور کا عہد

ام صائم۔ لاہور

دنیا میں جب آنکھ کھولی تو اذان اور اقامت کی آواز میرے لاشعور میں نقش ہو گئی۔ پھر جب میں نے تھوڑا سا ہوش سنبھالا اور بولنا سیکھا تو میں نے اپنی ماں کو پایا جو مجھے سوتے جاگتے اس دین کو قائم کروانے کی تیاری میں مشغول تھی صرف باتوں سے نہیں بلکہ عمل سے بھی۔

مجھے یاد ہے رات کو جب میں اپنی ماں کی آغوش میں سمٹ جاتی تو وہ مجھے نماز میں ادا ہونے والے کلمات یاد کرواتی اور میں وہ یاد کرتے کرتے سو جاتی۔ جب صبح اٹھتی تو ماں کو نماز ادا کرتے ہوئے قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھتی اور مجھے اٹھتے دیکھ کر میری ماں مجھ سے رات کو یاد کروائے ہوئے وہ کلمات دہرانے کو کہتی۔

اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں بہت چھوٹی تھی تو ماں سردیوں میں جب چولہے کے سامنے بیٹھی ناشتہ بنا رہی ہوتی تو میں اُس کی گود میں بیٹھ جاتی اور اُس وقت بھی مجھے کچھ نہ کچھ سکھا رہی ہوتیں۔ آٹے کا پیڑہ بناتے

ہوئے بھی بسم اللہ پڑھتی اور روٹی توے پر ڈالتے ہوئے بھی بسم اللہ ان کی زبان پر ہوتی۔

اور پھر مجھے آج تک یہ بھی یاد ہے کہ جب میں سات آٹھ سال کی ہوگئی تو سردیوں میں بھی ماں مجھے اٹھا کر برآمدے میں کھڑا کر دیتی کہ جاؤ وضو کر کے آؤ اور پھر ہمارے لحاف لپیٹ کر رکھ دیتیں اور نماز کے بعد ہم بھائی بہنوں کو قریب کی مسجد بھیجتیں قاری صاحب سے قرآن پڑھنے کے لیے۔

یہ سب باتیں میرے لاشعور میں تھیں جنھوں نے مجھے میرے بچوں کی تربیت کرنے میں بہت مدد دی اور آج بھی یہ تربیت میرے بہت کام آ رہی ہے۔ کیونکہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کے کانوں میں اذان او راقامت کی آواز گونج رہی ہے۔ اسے شعور دینا ہمارا کام ہے۔

اگر موت کا فرشتہ مہلت دے دے

تنویر ندیم۔ فیصل آباد

تھوڑی دیر کے لیے فرض کریں موت کا فرشتہ میرے سر پر کھڑا ہے اور صرف پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہے (اگرچہ ایک لمحے کی بھی مہلت نہیں ملتی مگر پھر بھی آج فرض کریں شاید یہ ہمارے کل کے لیے نافع ہو جائے)۔

ایسے میں میں کیا کروں گی؟

جواب شاید کچھ ایسا ہی ہو، توبہ کروں گی، اپنی غلطیوں اور گناہوں پر استغفار کروں گی، اللہ کے آگے روؤں گڑگڑاؤں گی یا اپنے پیاروں سے الوداعی ملاقات کروں گی اور انھیں وصیت کروں گی..... وغیرہ وغیرہ۔

گویا پانچ منٹ میں تو بس زیادہ سے زیادہ اللہ سے توبہ استغفار ہی ہو سکے گا۔ رہی اپنے پیاروں سے الوداعی ملاقات تو کون جانے ..... کہاں ..... کس بستی میں ..... کس مقام پر ..... فرشتۂ اجل جان قفس کرنے آ حاضر ہو اور اپنوں سے ملاقات کی مہلت ہی نہ مل سکے اور تحریری اور قانونی وصیت تو درکنار زبانی وصیت کا بھی موقع نہ ملے۔ مزید براں بلوغت سے لے کر آخری عمر تک وہ ہزاروں لاکھوں افراد جن سے رابطہ رہا۔ نجانے کہاں کہاں، کس کس کی، کیسے کیسے حق تلفی ہوئی ..... شاید اس کا شمار بھی نہ ہو سکے۔ چنانچہ ان تمام افراد کے حقوق کی ادائیگی یا حقوق العباد کی معافی چند منٹوں میں کیا..... کئی ہفتوں میں یا شاید کبھی بھی نہ ہو سکے۔ کیونکہ نجانے متاثرہ افراد ہی گزر چکے ہوں۔ یا ان سے رابطہ ہی نہ ہو سکے۔ یا یاداشت ہی جواب دے جائے یا ہمیں نہ رہیں۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ حقوق اللہ کی قضا کر لیں مگر حقوق العباد کی قضا نہ کریں۔

مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ''میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے روز بہت سی نماز، روزہ، اور زکوٰۃ لے کر آئے گا لیکن کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کو قتل کیا ہوگا۔ چنانچہ اس کی نیکیاں مظلوموں میں تقسیم کر دی جائیں گی۔ اگر نیکیاں ختم ہو گئیں (اور ان کے مطالبات باقی رہ گئے) تو مظلوموں کے گناہ اس کے نامۂ اعمال میں ڈالنے شروع کر دیے جائیں گے۔ حتیٰ کہ اس (ظالم اور کثرت سے عبادت کرنے والے کو) جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔''

لہٰذا ابھی، اسی لمحے آج ہی قریب سے دور تک۔

رشتہ داروں ،عزیزوں، ہمسائیوں، ملازموں ، ساتھیوں میں.....ازسرنو دیکھ لیا جائے کہیں کوئی مجھ سے ناراض تو نہیں؟ کہیں کسی کی مجھ سے حق تلفی تو نہیں ہوئی؟ کسی کا مذاق تو نہیں اڑایا؟ کسی کی نقل تو نہیں اتاری؟ کسی سے جھوٹ تو نہیں بولا؟ کسی کو کم تر تو نہیں سمجھا؟ کہیں کسی کی غیبت تو نہیں کی یا سنی؟ کسی کے بارے میں بدگمانی سے تو کام نہیں لیا؟ کسی سے حسد، کینہ یا بغض تو دل میں موجود نہیں؟ کسی سے تعزیت، عیادت یا غم خواری یا دلجوئی کا کوئی اخلاقی حق تو مجھ پر واجب نہیں؟ کوئی ایسا مصیبت زدہ یا حاجت مند تو نہیں جس کی مشکل کا حل میرے ذمہ واجب ہو مگر میں نے صرف نظر کیا ہو؟

یقیناً یہ جائزہ ومحاسبہ ہمیں دوسروں کے بہت سے حقوق کی حق تلفی سے بچائے رکھے گا بلکہ سلب شدہ حقوق کی تلافی اور زیادتی کے لیے بھی اور احسان سے کام لینے کے لیے بھی بہت سی راہیں سمجھا دے گا اور ہم بغیر کسی خلش اور خلجان کے، زیادہ سکون اور امید کے ساتھ اللہ کی رحمت کے طلبگار بن کر موت کو گلے لگا سکیں گے۔(انشاءاللہ)

میں کسی سے نہیں ڈرتا

نبیلہ شہزاد۔لاہور

گزشتہ برس کی بات ہے مدیرہ خواتین میگزین عابدہ عباس ہمارے ساتھ تھیں۔ ہماری گاڑی ٹھوکر نیاز بیگ کی طرف جا رہی تھی۔ گاڑی کی اگلی سیٹوں پر میرے شوہر شہزاد صاحب کے ساتھ عابدہ آپی کے پانچ سالہ صاحبزادے احتشام میاں براجمان تھے۔احتشام ہے تو بچہ مگر ماشاءاللہ باتوں میں بڑوں کو بھی لاجواب کر دیتا ہے۔

احتشام صاحب اپنی بہادری کے کارنامے بڑے پراعتماد انداز اور اشاروں کے ساتھ سنا رہے تھے۔کسی بات پہ شہزاد صاحب نے کہا اگر ایسا ہو تو پولیس والے بھی آ جاتے ہیں۔

''لو انکل! میں کیا جانوں پولیس والوں کو.....وہ تو بیچارے خود مجھ سے ڈرتے ہیں۔ میری ایک آواز کے ساتھ کانپنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کوئی پولیس والا میرے سامنے کھڑا نہیں ہوسکتا۔''

اتنے میں شہزاد صاحب نے کسی کام سے گاڑی روکی اور اتر کر چلے گئے۔ ہم لوگ اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ماما..... ماما.....اچانک احتشام کے منہ سے خوفزدہ آوازیں نکلنا شروع ہو گئیں۔ اس کا رنگ فق ہو چکا تھا وہ جلدی سے پیچھے آ کر آپی کی گود میں دبک کر بیٹھ گیا۔ ہم لوگ حیران تھے کہ اسے کیا ہو گیا مگر عین اسی لمحے ہمیں گاڑی کے سامنے قدرے فاصلے پر وردی میں ملبوس دو پولیس کے سپاہی کھڑے نظر آئے۔ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

☆☆☆

ملالہ اور اس کے پرموٹرز

معین اختر مرحوم منی بیگم کے حوالے سے ایک لطیفہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دفعہ پشاور میں منی بیگم ایک شو کرنے گئیں۔ غزل کی گائیکی اور منی بیگم کا دھیما انداز محفل کچھ دیر تک تو چلتی رہی، لیکن موسیقی کی کوئی ایک تال بھی ایسی نہ آئی کہ وہاں بیٹھے پختون جوش میں آ کر خٹک ڈانس کرنے لگیں۔ مجمعے کی اکتاہٹ دیکھ کر ایک شخص پستول ہاتھ میں پکڑے سٹیج پر آدھمکا۔ منی بیگم ڈر کر خاموش ہوگئیں۔ وہ ایک دم بولا ''تم گاؤ'' تم ہمارا بہن ہے، ہم تو اس کو ڈھونڈ رہا ہے جو تمہیں لے کر آیا تھا۔'' ملالہ یوسفزئی کی کتاب ''آئی ایم ملالہ'' پڑھنے کے بعد معین اختر کا یہ لطیفہ شدت سے یاد آتا ہے اور ساتھ ہی اس امریکی کا فقرہ بھی ذہن میں ہتھوڑے کی طرح ٹکرانے لگتا ہے جو اس نے ایمل کانسی کو پکڑ کر امریکہ کے حوالے کرنے کے بعد کہا تھا کہ ''پاکستانی پیسے کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔'' کرسٹینا لیمب، جس نے ملالہ کی باتیں سن کر یہ کتاب تحریر کی ہے، کو میں نے بلوچستان کے شہر پشین میں 1989ء میں ایک بلوچ سردار اور اس وقت کے وزیر کے ساتھ دیکھا تھا، جو اسے ہر پارٹی میں لیے پھرتا تھا۔ ملالہ کی یہ کہانی جو 276 صفحات پر مشتمل ہے، پڑھنے کی آپ کو شاید ضرورت نہ ہی پڑے اگر گزشتہ بیس سالوں سے اسلام، مسلمانوں اور خصوصاً پاکستان پر جو الزامات لگائے جاتے ہیں، جس طرح اسلام، مسلمان اور پاکستان کو بدنام کیا جاتا ہے، وہ سب آپ کے علم میں ہو۔ یہ تمام الزامات اور پھر کتاب سے سولہ سالہ ملالہ کی کہانی کے اقتباسات سامنے رکھیں تو آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھرے گا کہ اس کمسن بچی کے منہ سے میرے دین، مسلمان اور پاکستان کے لوگوں کے بارے میں ذلت آمیز لفظ کس نے ڈالے اور کس مقصد کے لئے ڈالے گئے؟ سب سے پہلے جس شخص کا تذکرہ ہے وہ سید الانبیاء ﷺ، امہات المومنین اور اہل بیت کے خلاف غلیظ الفاظ استعمال کرنے والا سلمان رشدی ہے، جو مغرب کی آنکھوں کا تارا ہے۔ اس کے بارے میں ملالہ لکھتی ہے: ''پاکستان میں اس کتاب کے خلاف مضامین سب سے پہلے ایک ایسے مولوی نے لکھنے شروع کیے جو ایجنسیوں کے بہت نزدیک تھا۔'' (صفحہ 30)۔ تاریخ کا یہ بدترین جھوٹ اس کے منہ میں کس نے ڈالا؟ اسے کس نے یہ لکھنے پر مجبور کیا کہ سلمان رشدی کو ''آزادیِ اظہار'' کے تحت یہ پورا حق تھا؟ تاریخ کے یہ اندھے کیا اس قدر لاعلم ہیں کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ سلمان رشدی کی کتاب کے خلاف مظاہرے سب سے پہلے لندن

اور یورپ کے شہروں میں شروع ہوئے تھے اور ایران کے روحانی پیشوا آیت اللہ خمینی نے تو اس کے قتل کا فتویٰ تک دے دیا تھا۔ لیکن ایجنسیوں کے ساتھ سید الانبیاﷺ کے عشق کو جوڑنے کی جسارت صرف ملالہ جیسی ''سولہ سالہ معصوم'' ہی کر سکتی ہے۔ اس کے بعد ضیاء الحق کا ایک مضحکہ خیز قسم کا حلیہ بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی وہ شور جو اس ملک میں مچایا جاتا ہے کہ ''عورتوں کی زندگی ضیا الحق کے زمانے میں بہت محدود ہوگئی تھی'' (صفحہ 24)۔ کوئی 1977ء سے 1988ء کے درمیانی عرصے میں ٹیلی کاسٹ ہونے والے پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈراموں کی فہرست اٹھالے تو اسے پتہ چلے گا کہ یہ پی ٹی وی اور ڈرامے کا سنہری ترین دور تھا۔ حسینہ معین، فاطمہ ثریا بجیا اور نورالہدیٰ شاہ اسی دور کی علامتیں ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ ان فقروں میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسے تمام سکولوں، یونیورسٹیاں، کالج بند کر دیئے گئے تھے اور عورتیں پس دیوار قید ہوگئی تھیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بیکن ہاؤس، سٹی سکول، امریکن سکول، گرامر سکول وغیرہ سب ضیا الحق کے دور میں کھلے اور اس ملک کے طول وعرض میں ان کی شاخیں کھولی گئیں۔ لیکن مغرب کو گالی دینے کے لئے ایسا آدمی چاہیے ہوتا ہے جو نماز پڑھتا ہو یا اللہ کا نام لیتا ہو۔ مغل سارے ظالم تھے لیکن گالی اورنگ زیب کو ہی دی جاتی ہے۔ یہ تصور اس پوری کتاب کے سبھی صفحات میں ملتا ہے اور یہ تصور اس سولہ سالہ معصوم ملالہ کے ''عظیم'' دماغ کا مرہون منت ہے۔ پاکستان سے محبت کا عالم یہ ہے کہ ملالہ پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے دن چودہ اگست کی خوشی منانے سے اپنے والد کے انکار کو فخر سے بیان کرتی اور بتاتی ہے کہ اس کے والد اور اس کے دوستوں نے اس دن بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھی تھیں (صفحہ 45)۔ پردے اور برقعے تو ایک معمول ہے، اس کا مذاق اڑاتے ہوئے ملالہ کہتی ہے کہ برقعہ ''گرمیوں میں ایک کیتلی کی طرح ہوتا ہے (صفحہ 51)۔ ملاعمر کا ذکر کرتے ہوئے اسے انتہائی تمسخر کے ساتھ (One eyed Mullah) کہا گیا ہے۔ میں یہاں اس کا ترجمہ نہیں لکھنا چاہتا کہ میرے آباؤ اجداد، میرے مذہب اور میری اخلاقیات نے مجھے اس طرح کے تمسخر کی تعلیم ہی نہیں دی۔

اس کے بعد امریکہ کے صدر بش کی زبان اس لڑکی کے منہ میں ڈال دی گئی اور وہ صفحہ 71 پر لکھتی ہے ''ہر کوئی سمجھتا ہے کہ مشرف ڈبل کراس کر رہے تھے، امریکہ سے پیسے لیتے تھے اور جہادی لوگوں کی مدد بھی کرتے تھے۔ آئی ایس آئی انہیں سٹریٹیجک اثاثہ سمجھتی تھی۔'' امریکہ کی زبان بولتے ہوئے ملالہ کو ذرا بھی شرم نہیں آئی کہ یہ وہی فوج ہے جس نے اس کے سوات کو بقول اس کے طالبان کے ''ظالمانہ شکنجے'' سے نکالا تھا۔ لیکن کیا کیا جائے اس ''سولہ سالہ معصوم'' ملالہ سے وہ سب کچھ کہلوانا مقصود تھا جو امریکہ اور اس کے حواری کہلوانا چاہتے ہیں۔ پاکستان اور اسلام کے ساتھ تمسخر کا وہی انداز ہے جو پوری مغربی

دنیا اوراس کے سیکولر حواری اپنی گفتگو میں اپناتے ہیں۔ ملالہ نے اسلام کی ساری تعلیمات کو، جو ہماری نصابی کتب میں پڑھائی جاتی ہیں، ضیاء الحق کی اختراع قرار دیا ہے۔ صفحہ 24 پر اس نے لکھا ہے کہ یہ سارا نصاب ضیاء الحق کے دور میں ہمیں یہ بتانے کے لئے ترتیب دیا گیا پاکستان اسلام کا قلعہ ہے۔ ملالہ کو قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا دکھ بھی بہت ہے کہ اس کے نزدیک یہ کام تو پارلیمنٹ کا تھا ہی نہیں۔ اس کے نزدیک بچوں کو یہ پڑھانا بھی غلط ہے کہ ہم ایک مضبوط قوم ہیں اور بھارت سے جنگ جیتنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے مطابق انہیں اصل حقائق بتائے جانے چاہئیں کہ ہم جنگ ہارے بھی تھے۔ یہ تاریخی طور پر صحیح ہوگا لیکن کیا دنیا کے کسی ملک میں بچوں کو ایسا پڑھایا جاتا ہے؟ کیا امریکی بچے پڑھتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد نے ریڈ انڈین کا قتل عام کیا تھا اور ان کے پچاس ہزار دفعہ معاہدہ کیے اور توڑے تھے؟ ملالہ نے اپنے بچپن کا ہیرو سکندر اعظم بتایا ہے (صفحہ 20)۔ اس لیے کہ اس ''معصوم'' نے سکندر کا جو چہرہ انگریزی نصابی کتب میں پڑھا، وہ ایسا ہے کہ بچے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ پورے مغرب میں بچوں کو کوئی نہیں پڑھاتا کہ سکندر وہ ظالم تھا جس نے تھیبس شہر کے تمام شہریوں حتیٰ کہ معصوم بچوں کو صرف اس لیے قتل کر دیا تھا کہ انہوں نے دیواروں پر اس کے خلاف نعرے لکھے تھے۔ اس نے دنیا میں پہلی دفعہ سفارت کاروں کو قتل کرنے کی رسم ڈالی تھی۔ اس نے ایران کے مشہور پارسی عبادت خانے پرسی پولس کے اس لیے تباہ کیا تھا کہ اس میں موجود خزانہ لوٹ سکے۔ لیکن ملالہ نے اپنے والد کے قائم کردہ سکول میں بچپن میں جو نصاب پڑھا تھا اس کے مطابق سکندر ایک ہیرو ہے۔

اپنے آباؤ اجداد کا تمسخر اڑانے کا درس صرف مسلمانوں کو دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اپنے بچوں کو حقائق بتاؤ، لیکن کوئی اس اصول کو اپنے ملک میں نافذ نہیں کرتا۔ یہ کتاب اب یورپ کی ہر دکان پر موجود ہے، امریکہ کے بازاروں میں اور پاکستان کے ہر انگریزی پڑھنے والے قاری کی دسترس میں ہے۔ لوگ یہ یقین کیے بیٹھے ہیں کہ ایک سولہ سالہ معصوم بچی کسی عالمی سوچ اور خیالات رکھتی ہے۔ وہ تو وہی کہتی ہے جو پورا مغرب کہتا ہے۔ اسے بھی پاکستان، اسلام اور مسلمانوں میں وہی خرابیاں نظر آتی ہیں جو پورے مغرب کو نظر آتی ہیں۔ ایک معصوم بچی حالات وواقعات کا کس قدر ادراک رکھتی ہے۔ ایسی بچی کو تو آنکھوں کا تارا ہونا چاہیے۔ خاندان کے منہ پر کالک ملنے والی بچی قابلِ عزت گھر کے عیب کی پردہ پوشی کرنے والی فرسودہ، دقیانوس اور جاہل۔ یہ ہمارے میڈیا پر روز چیخنے چلانے اور اس ملک کی توہین کرنے والے لوگوں کا معیار۔ لیکن کیا کریں، یہ سب ہمارے اپنے ہیں'' ہم تو ان کو ڈھونڈتا ہے جو ان کو کھلاتے پلاتے، اوڑھاتے اور زندگی کی آسائشیں فراہم کرتے ہیں۔''

☆☆☆